سلسلہ تصنیفات مسلم بک سوسائٹی نمبر ۸

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

سیرِ افکار

یا

روحانیات فی الاسلام

یعنی

نتیجہ افکار خواجہ کمال الدین صاحب بانی مسلم مشن ووکنگ (انگلستان)

بر مسائل روحانیات مشرق و مغرب

جس کو

مسلم بک سوسائٹی عزیز منزل لاہور نے

سنہ ۱۹۲۱ء میں شائع کیا

مطبوعہ کریمی پریس لاہور

باہتمام میر امیر بخش مینیجر چھپا

بلاد غربیہ میں اسلام کا مشعل بردار

اسلامک ریویو مجریہ انگلستان قیمت سالانہ عہ

اس کا اردو ترجمہ

اشاعت اسلام

ایڈیٹر۔ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب بی اے ایل ایل بی مسلم مشنری

مسلم پبلک میں اسلامک ریویو کسی معرف کرانے کا محتاج نہیں ہم صرف برادران اسلام کو یہ اطلاع دینا چاہتے ہیں۔ کہ اس وقت اسی کے منافع پر انگلستان میں اسلامی مشن کے اخراجات بہت حد تک چل رہے ہیں اس کا ہر ایک خریدار اب گویا بلاد غربیہ میں اسلام کا خود متکفل ہو جاتا ہے اگر برادران ملت کوشش کر کے انگریزی رسالہ کے پانچ ہزار اور اردو کے دس ہزار خریدار پیدا کر دیں تو ان کا منافع ہمارے ووکنگ اسلامی مشن کا تکفیل ہو سکتا ہے ہم چاہتے ہیں کہ انگریزی رسالہ کئی ہزار تک بلاد غربیہ میں مفت تقسیم ہو۔ اگر کوئی تبلیغ اسلام کا شیدائی ہمیں پانچ روپے سالانہ بھیجدے تو ہم انکی جگہ ایک انگریزی رسالہ یورپ میں مفت تقسیم کر دینگے

کیا ملت بیضا کی اشاعت کے عاشق چند ہزار بھی ہندوستان میں نہیں؟

دوستو اٹھو! جاگو!! وقت کو غنیمت سمجھو!!! اسلامک ریویو ایک کامیاب ذریعہ اشاعت اسلام کا ثابت ہوا ہے۔ اور بفضلہ تعالیٰ اس نے اپنی عزت کو یورپ میں نہایت آب و تاب سے قائم کیا ہے اس کو مضبوط کرنے کی کوشش کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے اجر جزیل پاؤ گے۔ والسلام

المشتہر خواجہ عبد الغنی مینیجر رسالہ اسلامک ریویو و اشاعت اسلام عزیز منزل لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

روحانیات فی الاسلام

مقالہ اوّل

حکومتِ ذرات

آج یورپ میں روحانیت کی لہریں اُٹھنے لگی ہیں۔ مغربی قومیں مادیت پرستی سے بیزار ہو کر آہستہ آہستہ اس کوچہ میں قدم رکھنے لگی ہیں جس سے وہ ہزارہا برس سے ناآشنا ہیں۔ مگر وہ اس وقت قلب کی اُن کیفیات میں پڑ گئی ہیں جنہیں ہمارے سلف صالحین نے لہو و لعب قرار دے کر سالک کو ان باتوں سے روک دیا ہے۔ اُن میں آج حلقہ بندی۔ حضوری فی الشیخ توجہ۔ قوت ارادی کی مشقیں جاری ہیں۔ سلب امراض

کشف صدر کا ادعا بھی ہو رہا ہے۔ اشراقیت کے خفیف سے خفیف رنگ بھی جلوہ آرا ہو رہے ہیں۔ یہ آثار برے نہیں اور انہیں اس منزل سے نکال کر اسلامی روحانیت پر کھڑا کرنا مشکل نہ ہو گا۔ اگر اللہ تعالےٰ ہماری قوم کے صاحب دل اور صاحب قلم اصحاب کی توجہ اس طرف پھیر دے +

جو لوگ تکمیل نفس کر لیتے ہیں۔ ان کے آگے یہ باتیں ہیچ ہیں۔ تکمیل نفس اسلامی نقطۂ خیال سے وہ مقام ہے جہاں انسان خدا کا مظہر بن جاتا ہے۔ اس وقت قوائے فطریہ اور ذرات کائنات پر ایک حد مناسب تک اس کی حکومت ہو جاتی ہے۔ اور یہ میں نہیں کہتا بلکہ قرآن کہتا ہے۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون۔ نحن اولیاء کم فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الاخرۃ ولکم فیہا ما تشتہی انفسکم ولکم فیہا ما تدعون نزلا من غفور الرحیم۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس قول کے مطابق حالات

زندگی میں) استقامت دکھلاتے ہیں اُن پر فرشتے نازل ہونے شروع ہوتے ہیں۔ جو انہیں کہتے ہیں کہ تم کوئی غم فکر یا خوف نہ کرو۔ ہم تمہیں موعود جنت کی خوشخبری دیتے ہیں۔ اس دنیا میں اور ایسے ہی آنے والی دنیا میں ہم تمہارے سربراہ ہیں۔ جہاں تمہیں تمہارے دل کی مرادیں ملیں گی۔ جو چاہو گے لے لو گے۔ اور یہ خدائے غفور و رحیم کی طرف سے مہمانی ہے +

قرآن نے اس آیت میں نہ صرف تکمیل نفس کے ایک اعلےٰ مقام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کے کوائف سے ہی ہمیں اطلاع دی ہے۔ بلکہ وہ راہ بھی بتلا دی ہے جس پر چل کر ہم منزل مقصود پر پہنچ جائیں۔ اس اجمال کی تفصیل میں آگے چل کر انشاء اللہ بیان کروں گا۔ لیکن یہاں میں اُن تعلقات کو اپنی سمجھ کے مطابق بیان کر دیتا ہوں جو از روئے تعلیم قرآن مجید انسان اور ملائکہ میں پائے جاتے ہیں +

فرشتے وہ ذی رُوح اور ذی تدبیر ہستیاں ہیں کہ جن کے ذریعے کائنات میں منشائے ایزدی کا اظہار

ہوتا ہے۔ ذرات کائنات انفرادی و اجتماعی حالت میں جن ربانی تجلیات کے مظاہر ہوتے ہیں انہیں اصطلاح عامہ میں خواص الاشیاء کہتے ہیں۔ ان بالقوہ خواص کو حسب ضرورت بالفعل کرنا فرشتوں کے متعلق ہے۔ فی الجملہ قوائے فطریہ جن میں قوائے و اخلاق انسانی بھی شامل ہیں اُن سے اُن کا مفوضہ کام لینا فرشتوں کے ذمہ ڈالا گیا ہے۔ عربی کا لفظ ملک (فرشتے) خود اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ملک کے جہاں ایک معنی قوائے ہیں وہاں وہ ذی ارادہ وجود بھی ملک ہی کہلاتے ہیں جو ان قوائے کو حرکت میں لاتے ہیں۔ ان دو معنوں میں عدم امتیاز نے بعض اصحاب میں فرشتوں کے متعلق وہ خیالات پیدا کر دیئے ہیں جن سے متقدمین میں معتزلہ اور متاخرین میں نیچری پیدا ہو گئے ہیں یہاں مجھے ان بحثوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے اسلاف و اخلاف کی یہ دو جماعتیں کہاں تک راستی پر ہیں +

ان ہستیوں (ملائکہ) کا تعلق جہاں تک انسان سے ہے وہ چار طرح کا ہے۔ اوّل۔ ملائکہ انسان کے نعم القرین ہو کر

اس کو نیکی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ہمارے دل میں اچانک نیک خیالات یا نیک تحریکات کا القا وقتاً فوقتاً انہی کی طرف سے ہوتا رہتا ہے پس اگر انسان ان اندرونی آوازوں پر کان دھرے اور ان پر عمل پیرا ہو تو یہ ہستیاں بعد میں اسکی ہادی اور معلم ہو جاتی ہیں۔ یہ دوسرا تعلق ہے جو فرشتوں اور سعید انسان میں قایم ہو جاتا ہے تیسرا تعلق وہ ہے جس کی طرف آیات مذکورہ بالا اشارہ کرتی ہیں۔ یعنے ملائکہ انسان کے دلی رہنما و سربراہ ہو جاتے ہیں۔ اس مقام پر انسان اسم رب کا مظہر ہو جاتا ہے لیکن سالک کا قدم اگر اس سے بھی آگے جائے اور اُس میں تمام اخلاق الٰہیہ پیدا ہو جائیں اور وہ صبغۃ اللہ میں رنگین ہو جائے تو اس وقت ایسا انسان مسجود ملائکہ ہو جاتا ہے وہ زمین پر خدا کا مظہر اور خلیفۃ اللہ بن جاتا ہے۔ اب اگر کل قوائے فطریہ ملائکہ کے زیر حکومت ہیں تو جس انسان کے وہ ولی یا خادم ہوں وہ انسان پھر کیوں ان قوائے پر حکمران نہ ہو۔ چنانچہ آیات مندرجہ بالا کا آخری حصہ اسی طرف اشارہ فرماتا ہے۔ ولکم فیہا ما تشتھی انفسکم ولکم

فیہا ماتدعون (اس مقام پر پہنچکر تم جو چاہو گے جو مانگوگے وہ فرشتوں کے ذریعہ تم کو مل جائیگا)

ہم ذات باری کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے۔ ہم نے جو کچھ سمجھا وہ اس کے وہی صفات ہیں جن کا ذکر قرآن مجید اور کسی قدر دیگر کتب مقدسہ میں ہے۔ یعنی ہمارا اللہ وہ پاک ذات ہے جس میں جمیع صفات حسنہ مندرجہ قرآن اپنے کامل رنگ میں جمع ہو گئی ہیں۔ ان صفات کاملہ والی ہستی ذرات عالم پر حکمران ہے اور اس کی حکومت کا نفاذ بذریعہ ملائکہ ہوتا ہے۔ اب ایک طرف خدا تعالیٰ کا ہمیں اپنی تصویر بنا کر ہم میں بحدود بشریت صفات الٰہیہ کے حصول کی استعداد رکھنا دوسری طرف ان صفات کے حصول کے لئے مخبر صادق کی معرفت ہمیں ہدایت فرمانا۔ جیسے کہ حدیث شریف تخلقوا باخلاق اللہ کہہ رہی ہے۔ تیسرا ملائکہ کا ہم سے مندرجہ بالا تعلق رکھنا۔ یہ سب امور اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ ہم بھی صبغتہ اللہ بن کر ذرات کائنات پر بحد امکان حکمران ہو سکتے ہیں۔ انی جاعل فی الارض خلیفتہ کی منشا بھی صحیح معنوں میں اسی وقت

پوری ہونے لگتی ہے جب انسان میں یہ کمال پیدا ہو جائے +

اس قسم کے انسانوں سے معجزہ اور کرامت کا ظہور ہوتا رہتا ہے لیکن یہ امر بھولنا نہ چاہئیے کہ ایک سالک کا مقصد نہ تو ذرات عالم پر حکومت کرنا ہے اور نہ فرشتوں کو اپنا باجگذار بنانا ہے۔ بلکہ اصلی مقصد تو اپنے اندر اخلاق الٰہیہ پیدا کرنا ہے۔ وہ امور جن کا نام دنیا نے خوارق رکھا ہے وہ بھی ایک سالک کا نصب العین نہیں ہوتے بروقت ضرورت یہ امور خود بخود ہی اس سے سرزد ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک کامل مہندس جس کے پیش نظر فلکیات ہوں۔ وہ اقلیدس۔ الجبرا کے اصول سے ناواقف نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ وہ علم اقلیدس کے کسی مشاق طالبعلم کی طرح بعض سوال حل نہ کر سکے۔ مگر وہ نتائج اقلیدس پر عبور کی طاقت حاصل کر چکا ہے۔ ایک طبیب حاذق یا ڈاکٹر طبعیات علم کیمیا۔ علم نباتات قریباً سب علوم سے کم و بیش واقف ہوتا ہے۔ بلکہ ان علوم کا جاننا ابتدائی حالت میں اُسے ضروری بھی ہے۔ وہ چاہے تو ان میں مہارت

تامہ پیدا کرے۔ لیکن ایسا کرنا اُس کے مقصد میں شامل نہیں۔ الغرض جس طرح ایک طبیب کی راہ میں بعض مادی علوم اور ایک مہندس کی راہ میں علوم الجبرا۔ اقلیدس آجاتے ہیں اسی طرح ایک سالک کے راستہ میں بھی وہ امور جو لوازم خوارق ہیں امکاناً آجاتے ہیں وہ بھی ذرات کائنات پر حکم فرمائی کے راستوں سے واقف ہوتا ہے۔ اور اگر اُس کے پیش نظر مقاصد عالیہ کا حصول ظہور خوارق کا متقاضی ہو تو حکم خداوندی کے ماتحت اُس سے بھی خوارق سرزد ہو جاتے ہیں جنہیں مذہبی اصطلاح میں معجزہ و خوارق کہتے ہیں۔ لیکن خوارق بالذات ہرگز مقصد سالک نہیں۔

خوارق کیا چیز ہیں؟ ذرات عالم پر غیر عادیہ طریق سے حکومت کرنا۔ ایک باغبان کا زمین کو درست کر کے مقررہ طریق پر تخم ریزی و آبپاشی سے اپنے وقت پر پھل حاصل کرنا۔ دراصل مختلف ذرات کائنات پر حکومت کرنا ہے۔ یہ طریق برت کر قوائے فطریہ کی امداد سے ان ذرات کو اس پھل میں جمع کر لینا ہے جو اُس پھل کے اجزاء ہیں بالمقابل ایک شخص اگر زمین میں کوئی تخم دبا کر آناً فاناً ایک باثمر درخت

کھڑا کر دے تو اس نے بھی ذرات مختصّہ کو ہی جمع کیا ہے۔
البتہ ایک شخص نے مقرّرہ طریق سے تمسک کیا ہے لیکن
دوسرے نے وہ راہ اختیار کی ہے جس سے عوام نا آشنا ہیں۔ دونوں
نے ذرّات عالم پر حکومت کی ہے لیکن جو غیر عادیہ طریق پر
چل رہا ہے وہ صاحب خوارق کہلاتا ہے۔ کائنات
میں ذرات عالم پر تین طرح سے حکومت ہوتی نظر آتی ہے
علمی - ارضی - سماوی - پہلی حکومت کی کنجی علم خواص الاشیا
ہے۔ ہم نے اپنی کتاب " التوحید فی الاسلام " میں اس حکومت
کی تشریح کر دی ہے۔ ابوالبشر کے قصہ میں جناب آدمؑ کا
مسجود ملایک ہونا یہ ظاہر کر رہا ہے کہ انسان میں خدا تعالےٰ
نے قوائے فطریہ پر حکومت کی استعداد رکھدی ہے۔
اس استعداد کا ظہور اس وقت انسان سے ظاہر ہوتا
ہے جب وہ علوم قوائے فطریہ میں مہارت پیدا کر لیتا ہے
ذرات یا انکے ہیولے اس شخص کے ہاتھ تلے اپنے کرشمے دکھلانے
شروع کر دیتے ہیں جو ان کے خواص کے ظہور کی راہوں
سے آگاہ ہو۔ ان راہوں کا دریافت کرنا اور پھر ان کے مطابق
عملدرآمد کرنا علوم جدیدہ سے تعلق رکھتا ہے۔ آج سائنس

کے کرشمے کامل طور سے معجز نمائی کر رہے ہیں۔ اسی جنگ یورپ کی طفیل ایک نئے علم کی بنیاد پڑ گئی ہے جسے نیورالجی (یعنے علم عصبات انسانی) کہتے ہیں۔ آج اس علم کے طفیل طبیب کے چند اشارات پر بعض گونگے بولنے لگ گئے۔ اندھے دیکھنے لگ گئے۔ لنگڑے چلنے لگ گئے نہ کوئی دوا استعمال ہوتی ہے۔ نہ کوئی دبر یا علاج شروع ہوتا ہے معالج کے چند کلمات واشارات شفا بخش ثابت ہو رہے ہیں۔ صرف اب کسی کا ملیّت کا جی اٹھنا باقی رہ گیا ہے والا انجیل کے معجزات آج نیورالجی کے کرشمے بن رہے ہیں الغرض جو جن اشیاء کے خواص سے واقف ہو جاتا ہے وہ اُن اشیاء کے متعلقہ ملائکہ کا مسجود بن جاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ وہ تا بحد علم خود ذرات عالم پر حکومت کرتا ہے بحری برّی۔ ہوائی سواریاں اسی حکومت کے نشانات ہیں ہاں یہ حکومت مخلوقات سے صرف انسان ہی کے حصہ میں آئی ہے۔ جس لحاظ سے وہ خلیفۃ اللہ کہلانے کا حقدار ہوا +

ذرّات عالم پر دوسری طرز حکومت وہ ہے جو معدنیات

نباتات۔حیوانات۔یازمین سے دوسری نکلی ہوئی چیزوں کو اپنی جلب منفعت یا دفع مضرت کے لئے اپنے ماحول پر حاصل ہوتی ہے۔درخت جہاں بھی کھڑا ہو ذرات آبی کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔پہاڑوں پر بارش کی کثرت کا ایک بھاری سبب درختوں کی کثرت ہے۔ہزاروں میل پرسمندر سے اُٹھکر پانی کے ذرّے پہاڑوں کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں ✤

اگر حیوانات کے حالات وعادات پر غور کیا جائے تو اُن میں یہ حکومت ایک دوسرے سے بالکل جدا نظر آتی ہے۔یہ امر ظاہر ہے کہ ہر حیوان میں ایک خاص قسم کا ادراک ہوتا ہے۔گو مختلف حیوانات کے جسم کی ترکیب ایک ہی قسم کے ذرات سے واقع ہوتی ہے لیکن ترکیب جسم میں یہ ذرات مختلف حیوانات میں بمقدار مختلفہ جمع ہوتے ہیں۔یہی اختلاف مقدار حیوانات میں مختلف شکلیں مختلف دل ودماغ پیدا کردیتا ہے۔اسی سے مختلف مدرکات پیدا ہو کر حیوانوں میں مختلف عادات وکیفیات کا باعث ہو جاتے ہیں۔دنیا نے جن چیزوں کا نام خوارق۔کرامت۔یا شکتی رکھا ہوا ہے

اگر اُن کو بنظر غور دیکھا جائے۔ تو یہ امور وہی ہوتے ہیں جو دوسری مخلوقات سے عادتاً سرزد ہوتے ہیں۔ ایک کی عادت دوسرے کے لئے خوارق کہلاتی ہے۔ کہیں کہیں جو بعض شکتیاں جوگیوں کی سننے میں آئی ہیں۔ وہ در اصل اُن قوتوں کا اظہار ہوتا ہے جو بعض حیوانات میں طبعاً پائی جاتی ہیں۔ جناب علی ہمدانی رحمۃ کا ایک جوگی کے اُڑنے پر یہ فرمانا کہ "ایں از زاغ و کرگس ہم مے آید"۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور یہ بات بھی سچ ہے۔ فوق الطاقت باتیں وہی کہلاتی ہیں جو امور عادیہ سے بالا ہوں۔ وہی باتیں جو ایک کا معمول ہیں۔ دوسرے کے لئے خوارق ہو جاتی ہیں۔ مثلاً بعض حیوانات میں اس درجہ کی قوت مقناطیسی ہوتی ہے کہ اگر اس کا عشر عشیر بھی کسی انسان میں نمو پا جائے تو اس سے بعض امور فوق العادت کے رنگ میں ظاہر ہونے لگیں۔

نیچرل ہسٹری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ بعض حیوانات بعض ذرات یا اُنکے ہیولوں پر عجیب و غریب قابو رکھتے ہیں وہی باتیں جو ان حیوانات سے سرزد ہوتی ہیں اگر انسان سے سرزد ہوں

تو انہیں بجا طور پر امور خارق کہا جا سکتا ہے۔ یہ مختلف حکومتیں مختلف حیوانات کے مدرکات مختلفہ کا نتیجہ ہیں جیسے ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ یہ امر مسلم ہے کہ مدرکۂ انسانی کی جامعیت تمام مدرکات حیوانیہ پر حاوی ہے۔ انسان کا دل و دماغ شیر۔ بھیڑیا۔ گائے۔ اونٹ۔ سؤر۔ کتا۔ سانپ۔ بلی۔ کبوتر۔ الغرض کل حیوانات عالم کے دل و دماغ کا نچوڑ ہے۔ ان تمام حیوانات کی کیفیات قلبی بحدود مناسب قلب انسانی میں موجزن ہوتی رہتی ہیں۔ انہی کیفیات حیوانیہ کی تعدیل و تہذیب کا نام قرآن کریم نے تکمیل نفس رکھا ہے۔ ہاں اعتدال کو چھوڑ کر جس کیفیت کو چاہے انسان اپنے اندر بڑھا لے۔ حسب تعلیم قرآن پاک یہی حقیقت گناہ ہے۔ حد کو چھوڑنا ہی انسان کو انسانیت سے گرا کر شیر بھیڑیا۔ سؤر۔ کتا۔ بنا دیتا ہے۔ بعض انسان اپنی موت پر ان کیفیات حیوانیہ کو لئے ہوئے یہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔ ان کا روحانی حشر ان حیوانات کا حشر ہوتا ہے۔ اور اسی کیفیت ردیہ سے پاک صاف ہونے کے لئے جو مقام ہے دوزخ اسی کا نام ہے۔ کیونکہ جنت تو انسانوں کے لئے ہے

یہ لوگ دراصل اپنے حشر پر سؤر۔ کتا۔ بھیڑیا۔ یا کوئی اور حیوان بلباس انسان ہوتے ہیں۔ اور جہنم میں وہ انسان ہی بننے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت حقہ ہے۔ جس سے کوئی اہل دل ناآشنا نہیں۔ زمانہ سلف میں کسی ہندو رشی پر اسی راز کا انکشاف ہوا ہو گا جس کی غلط روایت یا درایت نے مسئلہ تناسخ کی صورت اختیار کر لی۔ کونوا قردۃ خاسئین (ذلیل بندر ہو جاؤ) کی حقیقت بھی یہی ہے *

الغرض انسان میں مختلف حیوانات کے مدرکات ہیں۔ انسان و حیوان دونوں ذرات عالم پر اپنی اپنی طرز میں حکومت کر رہے ہیں۔ ایک کی طرز کا دوسرے میں پیدا ہو جانا لازماً ایک امر غیر عادیہ ہو گا۔ انسان میں خدا نے یہ طاقت رکھی ہے کہ وہ اپنے اندر کسی دوسرے حیوان کا مدرکہ بڑھالے۔ اس صورت میں وہ بھی اس حیوان کی طرح ذرات متعلقہ پر حکمرانی کر سکتا ہے الغرض ذرات عالم پر حکومت کی یہ دوسری طرز اگر انسان میں پیدا ہو جائے تو علوم جدیدہ کی طرح اس سے مختلف کرشمے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ یہ حکومت تو انسان حاصل کر سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ایک نقص بھی لاحق ہو جاتا ہے

جتنے انسان درجہ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ جس کو انشاء اللہ آیندہ ہم مفصل لکھیں گے۔ یہ وہی ذرات پر حیوانی حکومت ہے جو مسمریزم۔ ہپناٹزم۔ اکلٹزم (مغربی باطنیات) کی مختلف شکلوں سے متعلق ہے۔ انہیں اس کتاب میں ہم **عمل الترب** کے نام سے موسوم کرتے ہیں انسان حیوان۔ درخت۔ معدنیات۔ کیڑے مکوڑے یہ سب کے سب مٹی (تراب) کی مختلف صورتیں ہیں۔ مختلف ہوتے مختلف قدرت اور طاقت اپنے اندر رکھتے ہیں بعض انسان چونکہ بعض خاص مشقوں اور عملوں سے مٹی کی صورتوں کے خواص اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن یہ سب کی سب سفلی باتیں ہیں انہیں انسانی فطرت سے تعلق نہیں۔ اسے یہ امر بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ کیوں وہ بہت سی باتیں جنہیں غلطی سے آج مایۂ تصوف سمجھا جاتا ہے وہ غیر مسلموں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ آجکل قوت ارادی اور توجہ کے کرشمے ہر قسم کے لوگوں کو اپنا مرید بناتے چلے جاتے ہیں بہت سے خوارق کا ظہور انہی سے وابستہ ہے۔ سلب امراض یا ایسی اور باتیں بھی توجہ کی مشق سے حاصل ہو جاتی ہیں +

اب یہ توجہ کیا ہے۔ اپنے دل و دماغ کو ایک خاص قسم کے مدرکہ کے اُبھارنے میں لگانا ہے۔ جس قسم کی قوت تم اپنے اندر بڑھانا چاہو وہ قوت تم میں بڑھ سکتی ہے۔ اگر اُس قوت کا ظہور جس جانور میں پوری قوت سے ہوگا اسی حیوان کے مدرکہ کی طرح تمہارا مدرکہ بھی ضرور ہے کہ ہو جائے۔ ہر ایک حیوان کا مدرکہ انسانی مدرکہ میں بالقوت تو موجود ہے اُسے ممیز طور سے بالفعل ہی کرنا ہے جس کے لئے بعض ریاضتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا خونخوارانہ خیالات میں توجہ لگانے سے یا خونخوارانہ کاموں میں انہماک سے انسان میں درندگی نہیں ہو جاتی۔ ٹھیک اسی اصول پر قوت ارادی و توجہ کی مشق انسان میں حسب دلخواہ قوتیں بڑھا دیتی ہے۔ تمہارا قوّت توجہ سے کسی ایسی قوّت کو اپنے اندر بڑھا لینا جو کسی حیوان میں برنگ عادیہ ظاہر ہوا ہے۔ دراصل اُس حیوان کے مدرکہ مختصہ کو اپنے اندر نمود دینا ہوتا ہے۔ اب اگر ان خوارق کی حقیقت یہ ہے تو مسلم صوفیائے کرام کا اُسے کھیل کود قرار دینا صحیح نہیں تو اور کیا ہے اس کی بوالعجبیاں انسان کو اپنے تماشوں میں محو کر کے اُسے منزلِ مقصود سے

روک دیتی ہیں۔ اگر اسلام نے اُنہیں سفلیات کہا تو بالکل صحیح بات ہے۔ پھر ان باتوں میں پڑنا وہ نقص انسان میں پیدا کر دیتا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ایسے انسان میں نہ صرف اخلاق فاضلہ کا ہی نام ونشان نہیں رہتا بلکہ بعض وقت اُس سے ذلیل سے ذلیل حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ عام لوگوں کے لئے یہ بات اکثر موجب حیرت ہوتی ہے کہ کیوں بعض لوگ ایک طرف تو وہ کمال رکھتے ہیں جو عوام کے نزدیک شایان ولایت ہونی چاہئیں۔ اور دوسری طرف وہ اخلاق ذمیمہ میں بھی گرفتار ہوتے ہیں +

ایک سادہ مزاج انسان کا دل ان باتوں کو سفلیات واستدراج کا نام دیکر اطمینان پالیتا ہے۔ لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ کلمہ گو لوگوں میں سے جس نے ایسی طاقتوں کی مشق سے ہماری ارادتمندی کو خرید لیا ہے وہ ان سفلیات سے الگ ہے۔ یہ ساری باتیں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اگر ہم امور بالا کو پیش نظر رکھیں +

مختلف حیوانات سے نہ صرف مختلف قوتیں ہی ظاہر

ہوتی ہیں بلکہ ان کے اخلاق بھی مختلف ہوتے ہیں۔ جسے ہم
جذبات حیوانیہ کہتے ہیں۔ یہ مختلف جذبات بھی ان ہی
مختلف مدرکات سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ
ایک حیوان کا مدرکہ اسی شے کے جذبات و اخلاق مختصہ کے
مجموعہ کا نام ہے۔ اس امر کو ہم کسی قدر تشریح سے اوپر
لکھ آئے ہیں۔ علمی دنیا میں یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ حیوانی
جسم ایک ہی قسم کے ذرات کی ترکیب سے پیدا ہوا ہے۔
جانوروں کی مختلف شکلیں جن میں انسان بھی شامل ہے مختلف
مقدار ذرات کا نتیجہ ہیں۔ یعنی ذرات تو وہی ہیں مگر شیر
میں بعض ذرات زیادہ ہیں جو بکری میں بہت کم ہوتے
ہیں۔ یہی کمی بیشی شیر کے تہور اور بکری کی بزدلی کا موجب
ہوتی ہے۔ الغرض مختلف مقدار ذرات کی ترکیب مختلف
جانوروں میں نہ صرف اعضاء کی شکل و نوعیت ہی بدل
دیتی ہے بلکہ یہی اختلافِ مقدار مختلف دل و دماغ
پیدا کر کے اختلاف ادراکات کا موجب ہو جاتا ہے۔
پھر یہی اختلاف نہ صرف مختلف طاقتیں ہی پیدا کرتا ہے
بلکہ مختلف اخلاق و جذبات بھی اسی سے پیدا ہوتے ہیں

انسان کے دل و دماغ نے بھی انہیں ذرات سے جن سے باقی کل حیوانات پیدا ہوئے ایک خاص مقدار و تقویم میں بناوٹ حاصل کی ہے جس سے جو ادراک پیدا ہوا ہے وہ مختلف مدرکات حیوانیہ کا مجموعہ ہے یہی وجہ ہے کہ انسان میں نہ صرف ان حیوانات کے قوائے حاصل کر لینے کی استعداد ہے بلکہ وہ اُن کے جذبات و اخلاق سے بھی متخلق ہو سکتا ہے۔ اب اگر اُن قویٰ کا جن سے کوئی حیوان ذرات عالم پر حکومت کرتا ہے اور ایسا ہی اخلاق مختصہ کا تعلق قطعاً مدرکات سے ہی ہے تو پھر جب انسان نے توجہ کے ذریعہ کسی خاص جانور کی قویٰ کو اپنے اندر پیدا کر لیا ہے۔ اُس نے دراصل اپنے اندر اُس جانور کے ادراک کو نشو و نما دیکر اس جانور کے اخلاق و جذبات ردیہ کو بھی اپنی طرف منتقل کر لیا ہے۔ تم بلی کی آنکھ کی سی قوت مقناطیسی اپنی آنکھ میں پیدا کر کے فاختہ مزاج انسانو پر بیشک قابو پا لو گے۔ لیکن اس صورت میں بلی کا ادراک بھی تم میں پیدا ہو جائیگا پھر تم بلی کے اخلاق ردیہ کے ظاہر کرنے سے نہیں رک سکتے۔ مثلاً سانپ کی آنکھ میں ایک خاص قسم

کی مقناطیسی طاقت ہے جس کا اثر خاص طور سے چڑیا پر ہوتا ہے۔ تمہاری آنکھ میں چشم مار کی کشش بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہزاروں چڑیا صفت انسان تمہاری طرف کھنچے آئینگے لیکن یاد رہے تم اور رنگوں میں بھی مار صفت ہو جاؤ گے۔ یہ ایک منٹ کے لئے بھی نہ بھولنا چاہئے کہ انسان اور حیوانات ایک ہی قسم کے ذرات سے بنے ہوئے ہیں۔ حیوانی جسم میں ترکیب ذرات جو اخلاق اور قوتیں پیدا کرتی ہے وہ بدل نہیں سکتے۔ لیکن وہی ذرات انسانی جسم میں کچھ ایسی مقدار اور ترکیب سے جمع کر دیئے گئے ہیں کہ انسان جس رنگ کا ہونا چاہے ہو جاتا ہے۔ اُس کے اخلاق بدل سکتے ہیں کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ گھوڑے کا بچہ گھوڑے کے ہی خواص لیکر پیدا ہوگا لیکن نوح ؑ کا بیٹا حیوانی جذبات کا مجسمہ ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسانی استعداد کی کوئی حد نہیں۔ باقی کل مخلوقات کی استعدادیں مقررہ اور محدود ہیں۔ اس راز کو بھی سب سے اول قرآن نے ہی کھولا۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددناہ اسفل سافلین۔ یعنی اگر انسان علیین تک پہنچ سکتا ہے

تو اسفل سے اسفل مقام تک کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ اگر وہ فرشتہ بن سکتا ہے۔ تو کتا۔ بلی اور سانپ بھی بن سکتا ہے۔ وہ تمام کے تمام مدارج و منازل جو ترقی کے سب سے اونچے مقام اور تنزل کے سب سے نچلے مقام میں ہیں۔ ان سب کے دروازے انسان کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ اس آیۃ کی حقیقت کو سعدی نے ذیل کے الفاظ میں کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ ؎

آدمی زادہ طرفہ معجونیست کز فرشتہ سرشتہ ور حیواں
گر کند میل ایں شود بہ ازیں ور کند میل آں شود بد ازاں

اب وہ کونسی مخلوق ہے اور کونسی عناصر کی ترکیب اور ہیولی ہے جس کے خواص.......جس کی سیرت جس کے ادراکات جس کے قوی انسان میں موجود نہیں یہ ہم لکھ آئے ہیں کہ وہ امر جو ایک چیز میں امر عادیہ ہے وہ دوسرے میں خارق ہو سکتا ہے۔ تم کسی جانور کی قوتیں اپنے اندر پیدا کر سکتے ہو۔ جانور چھوڑ کسی غیر ذی روح کے خواص بھی اپنے اندر پیدا کر سکتے ہو۔ لیکن یہ بات بھی یاد رکھو کہ ان قوی اور خواص کے حاصل کرنے سے تم اس جانور

یا اس چیز کے اخلاق۔ جذبات خواص بھی اپنے اندر پیدا کر لو گے۔ اب یہ امر سمجھنا مشکل نہ ہوگا۔ کہ کیوں مسلم صلحا نے سالک کو اس طرف جانے سے روکا ہے۔ اور کیوں بعض ان خوارق کے دکھلانے والے امور شنیعہ میں گرفتار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خوارق سالکان حقیقت کا بھی حصہ ہیں۔ چنانچہ اُن سے بھی یہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں لیکن وہ جس راہ پر قدم زن ہونگے اس میں یہ باتیں بطور امر حاصل شدہ آجاتی ہیں۔ جیسے ہم نے طبیب کی مثال دیکر بیان کیا ہے کہ اُس کا دیگر علوم پر بھی عبور ہو جاتا ہے سالکان طریقت کو بھی اپنی راہ میں توجہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ جن امور پر اپنی توجہ اور ہمت لگا رہے ہیں وہ اخلاق الٰہیہ ہیں۔ اور جن باتوں پر دوسری جماعت کی توجہ خرچ ہوئی ہے وہ قویٰ و اخلاق حیوانیہ ہیں۔ اس لئے صحیح طور پر ایک طریق کا نام علوی اور دوسرے کا نام سفلی رکھا گیا ہے۔ ایک کے ماتحت انسان اور اکات عالیہ یعنی ربانی و ملکی پیدا کرنا چاہتا ہے اور دوسری راہ پر چل کر حیوانات کے جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔ رہا

یہ کہ کس طرح اوّل الذکر یعنی صلحا کی جماعت بھی ذرات عالم پر حکومت کر سکتی ہے۔ ہم آگے چل کر لکھیں گے۔ سردست آخر الذکر جماعت کے متعلق میں کچھ اور بھی لکھنا چاہتا ہوں۔

مسلم ہندی یونانی فلسفیوں نے انسان کو عالم صغیر قرار دیا ہے۔ یعنی انسان کے جسم میں کل ذرات عالم کا جمع ہونا تسلیم کیا ہے۔ قرآن نے انسان کے متعلق ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین رہم نے انسان کو زمین کی کشید سے بنایا) کہکر یہ تعلیم دی ہے کہ انسان کے اندر کل ارضی مواد کی روح کھینچکر رکھدی گئی ہے۔ زمین کا اور ستاروں کی طرح نیبولا سے پیدا ہونا اگر سائنس نے آج تسلیم کیا ہے۔ تو قرآن نے بھی صریح اشارہ اس طرف کیا ہے۔ اس طرح انسان کے اندر کل کائنات کی اجزا بصورت کشید جمع ہو گئی ہیں اس میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کائنات کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خواص استعداداً انسان میں نہیں۔ پھر قرآن نے انسان کا تقویم احسن پر پیدا ہونا بتلاکر یہ اشارہ کیا ہے کہ انسان میں نہ صرف کل قوائے فطریہ موجود ہیں بلکہ ذرات مختلفہ کے مختلف تراکیب

سے جو مختلف ہیوے نجم ۔ شجر ۔ حجر ۔ حیوانات میں پیدا ہو جاتے ہیں اُن میں کی قوتیں بھی انسان سے ظاہر ہو سکتی ہیں ۔ یہ باتیں اب نظریات نہیں ہیں بلکہ علم اور تجربہ اس کے شاہد حال ہیں مثلاً کونسا جانور دنیا میں ہے اور کونسا باجہ انسانی صنعت نے پیدا کیا ہے جس کی آواز انسان کا حنجرہ اور گلو نہیں نکال سکتا ۔ یہ مختلف آوازیں عناصر کی مختلف تراکیب کا نتیجہ ہیں وہ ترکیبیں کسی جانور کے گلے کی شکل اختیار کر لیں یا ان کا نام ارغنوں ۔ ہارمونیم ۔ یا ستارہ ہو ۔ اگر انسانی گلو ان ساری آوازوں کے نکالنے پر قادر ہے تو یہ امر دو باتوں سے خالی نہیں ۔ اوّل انسانی گلے میں وہ سب کے سب عنصر موجود ہیں ۔ دوسرا بروقت نقل وہ عنصر اُس کے ارادے اور منشاء کے ماتحت وہی ترکیب خاصہ پا لیتے ہیں ۔ جو کسی جانور کے گلے میں یا کسی باجہ میں ہوتی ہیں ۔ اسی طرح انسان کی آنکھ عقاب کی آنکھ سے زیادہ دور اور تیز بین ہو سکتی ہے ۔ انسان کی ٹانگیں ایک تیز سے تیز گھوڑے سے سبقت لے جاتی ہیں انسان نہ صرف مچھلی کی طرح پانی میں تیر سکتا ہے ۔ بلکہ اسکی آنکھ بھی مچھلی کی ہی آنکھ کا کام دے سکتی ہے ۔ اس کے

اعصاب اور پٹھے کچھ ایسی طاقت اپنے اندر رکھتے ہیں کہ انسان خاص قسم کی نشستوں میں ایک موٹر کو روکنے کی طاقت اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔ عالم خواب کی جلوہ آرائیاں اور اُس عالم میں طرح طرح کے لذائذ سے متمتع ہونا یا مختلف طاقتوں کا ظہور پانا ایک متشکک یا مادیت پرست کے نزدیک خواب و خیال ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن وہ اس بات کا ثبوت دیتی ہیں کہ انسان کے اندر یہ سب طاقتیں موجود ہیں دماغ کا کسی کیفیت سے مکیف ہونا استعداد کیفیت کا سچا ثبوت ہے۔ پھر جب ایک طرف یہ امر ثابت ہو چکا کہ جسم انسانی میں کل ذرات عالم جمع ہیں اور دنیا و مافیہا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان ذرات کی تراکیب مختلفہ سے ہو رہا ہے۔ تو اگر یہ ذرات انسان کے اندر کسی طریق پر بروقت ضرورت ترکیب مطلوبہ پا لیں تو کیوں وہ ہی باتیں انسان سے سرزد نہ ہوں۔ جیسے ہم نے ابھی گلے کی مثال دیکر مبرہن کیا۔ اس بات کے متعلق یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر کسی مخلوق میں کوئی استعداد نہ ہو تو اس کی طرف اس میں میلان ہی نہیں ہوتا۔ ایک گائے کو گوشت خواری کی طرف اور ایک درندہ

کو گھاس کھانے کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ ایک پرندہ کو پانی کے اندر رہنے کا ایک مچھلی کو درخت پر آشیانہ بنانیکا خیال ہی نہیں آتا۔ اس کے بالمقابل انسانی خیال کو دیکھو تو وہ ہر مخلوق کی مختصہ حالات اپنے اندر پیدا کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اور وہ اس خواہش کے پورا کرنے میں آہستہ آہستہ کامیاب بھی ہو رہا ہے۔ اس خواہش کا پیدا ہونا ہی اُس میں استعداد مختصہ کے موجود ہونے کا ثبوت ہے۔ جس چیز کی لذت کی استعداد ہی کسی مخلوق میں نہیں ہوتی وہ اس لذت کے چکھنے کی طرف طبعاً مائل نہیں ہوتا۔ لیکن وہ کونسی لذّت اچھی یا بُری دنیا میں ہے جس کی طرف انسان مائل نہیں ہوا قرآن نے واعطٰکم من کل ما سئالتموھا کا وعدہ دیکر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ہم میں جو بھی صحیح خواہش اٹھتی ہے۔ اس کے حصول کی استعداد ہم میں اور اُس کے پورا ہونے کے اسباب دنیا میں موجود ہیں +

اب ہم پھر انسانی قویٰ کی طرف آتے ہیں۔ ہم میں ہر دوسری مخلوق کے ذرات کا جمع ہونا اور ان کا ہمارے اندر کوئی ترکیب پاکر بر وقت ضرورت اس مخلوق کا سا رنگ

دیو پیدا کر دینا اگر ممکن ہے اور ایسا امکان میں اوپر دکھلا چکا ہوں۔ تو پھر انسان سے خوارق کا سرزد ہونا کونسا مشکل امر ہے مثال کے طور پر یہ امر ایک طرف سائنس نے اور دوسری طرف اعلیٰ پایہ کے صوفیوں نے اپنے مکاشفات کی بنا پر تسلیم کیا ہے۔ جیسے حضرت محی الدین ابن عربی بیان کرتے ہیں۔ کہ ذرات عالم میں بعض ذرات کو دوسرے ذرات سے وصل اور فصل کی طبعاً رغبت ہے۔ یعنی بعض ذرات گو خواص میں الگ ہوں لیکن طبعاً ایک دوسرے سے آکر ملتے ہیں اور بعض دوسرے سے کوسوں بھاگتے ہیں۔ یہ جو بعض جانوروں کو بعض سے طبعاً دشمنی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک جانور دوسرے کو دیکھکر اگر کمزور ہے تو بھاگ جاتا ہے۔ اور اگر طاقتور ہے تو کمزور کے مارنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ اُسے اپنی خوراک نہیں بناتا۔ اس کا باعث بھی یہی خواص ذرات ہیں۔ یعنی ذرات متنافرہ کی الگ الگ قسمیں ان جانوروں میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس لئے جب بعض واقعات ان کو ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں۔ تو وہی نفرت ذرات یا ایک کو بھگا دیتی ہے یا ایک کو دوسرے

کا شکار کرا دیتی ہے ۔ اسی طرح یہ قوت مواصلت ذرات بعض جانوروں کو دوسرے جانوروں کے موہنہ میں خوشی سے لے جاتی ہے ۔ بلّی کے اندر بعض ذرات اس قسم کے ہیں کہ جس سے ملنے کا میلان کبوتر کے بعض ذرات میں ہوتا ہے ۔ ایسا ہی چڑیا کے بعض ذرات طبعًا سانپ کے بعض ذرات کی طرف کھنچے جاتے ہیں ۔ لیکن سانپ اور بلّی کے یہ ذرات اُسی وقت کام کرتے ہیں جب خاص حالات ان دونوں میں قوت ارادی کو حرکت میں لاتے ہیں ۔ اس وقت کبوتر اور چڑیا خود بخود سانپ اور بلّی کے مُنہ میں چلے جاتے ہیں ۔ یہ امر مسلم ہے کہ انسان میں یہ ذرات ہیں ۔ پھر اگر وہ اپنی قوت ارادی کو کسی خاص طریق پر مشق کرکے اس قابل بنالے کہ اپنے اندر کے ذرات جنہیں کبوتر اور چڑیا کے ذرات سے تعلق مواصلت ہے متحرک کرسکے تو یہ جانور اُس پر آ بیٹھینگے ۔ چنانچہ میں نے پیرس میں اپنی آنکھ سے ایک آدمی دیکھا جو پچھلے پہر کسی نہ کسی باغ میں جا بیٹھتا تھا اور اس کے اردگرد مرغان چمن جمع ہوکر اُس کے ماحول اور اس کے مختلف اعضا کو اپنا نشیمن بنا لیتے تھے ۔ ایسا ہی ایک اور آدمی

میں نے لندن میں فلیٹ اسٹریٹ کے محاذ دریائے ٹیمس کے کنارہ بیٹھے دیکھا۔ لیکن اُس کے گرد اس قدر پرند نہ تھے جیسے پیرس میں دیکھے۔ لیکن اُس کا حال بھی میں نے یہی سنا کہ جس وقت وہ آتا ہے اُس وقت اردگرد کے پرند جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت مرجعیت طیور آٹھوں پہر اُن میں نہ تھی۔ جب وہ چاہتے تھے ہو جاتی تھی۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ ذرات جو طیور کو کھینچ رہے تھے وہ اُن کے ارادہ تلے کام کرتے تھے۔ سانپ، شیر اور دوسرے موذی جانور بعض جانوروں سے طبعًا نفرت رکھتے ہیں۔ اور جہاں انہیں پائیں وہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ بعض جنگلوں میں ایک ڈیڑھ بالشت کی جسامت کا چارپایہ ہوتا ہے کہ جس کی شکل تو کیا بُو تک آنے سے شیر بھاگ جاتا ہے۔ پھر اگر کسی مرد خدا کی شکل دیکھنے سے شیر یا کوئی موذی جانور بھاگ جائے تو یہ واقعات سن کر ایک نخچیر مغربیات یا متشکک کو گھبرانا نہ چاہئے۔ وہ اسے ان بزرگوں کی توجہ کا نتیجہ سمجھے۔ وہ لا اف ریپلشن کو سامنے رکھے جس کے ماتحت ذرات کا تنفر مسلم ہے۔ وہ ذرات جس سے درندوں کے جسم کے ذرات

کو نفرت ہے۔ وہ انسان کے جسم میں موجود ہیں جو کسی مرد خدا کی توجہ سے اُس کے اندر متحرک ہو کر ہوڈیوں کو بھگا دیتے ہیں یہ وہی رنگ ہے جو انسانی حنجرہ کے متعلق ہم نے اوپر بیان کیا +

فزیالوجی اور علم تشریح کے جاننے والے اس بات کو سمجھتے ہیں۔ کہ جسم کے اندر جو ہالک اور حیات بخش جراثیم آٹھوں پہر کام کرتے ہیں۔ وہ ہر منٹ ہر لمحہ ایک دوسرے کے مقابل برسر پیکار رہتے ہیں۔ مختلف بیماریوں کا پیدا ہونا۔ ہالک کے جراثیم کے غلبہ سے ہوتا ہے۔ اور مختلف ادویات کا دینا دراصل جراثیم ہالکہ کے مقابل حیات بخش جراثیم کی طاقت کو بڑھانا ہے۔ ان متضاد جراثیم کے پیدا کرنے والے ذرات ہمارے جسم میں آٹھوں پہر موجود ہیں اب اگر یہ ممکن ہے کہ باہر سے ادویات بھیجنے کی بجائے انسانی ارادہ ذرات متعلقہ کو محرک کر دے تو پھر توجہ اور ارادہ کے ماتحت امراض کا دفع کرنا یا پیدا کرنا ایک امر ممکن ہے اسے کرامت کہا جائے یا استدراج۔ مگر یہ باتیں ممکن الوقوع ہیں۔ بدنظری کے کرشمے خواہ کسی تشریح تلے آئیں اُن کا

نام جادو رکھا جائے۔ یا اُنہیں قوت مقناطیسی کہا جائے
اُس کی حقیقت یہ ہی ہے۔ تربیت یافتہ ارادہ انسان
بعض ذرات کو بعض ذرات کے خلاف لڑا رہا ہے۔ بارش
کے اجزاء جس جگہ بھی موجود ہوں۔ وہ ان مقاموں پر طبعًا
پہنچ جاتے ہیں جہاں کثرت سے درخت ہوتے ہیں یہاں
بھی وہی باہمی کشش ذرات مختلفہ کام کر رہی ہے۔ پھر کیا
یہ امر مشکل ہے کہ کسی کی توجہ اور اس کی عقد ہمت اپنے اور
اپنے رفقاء کے اندر سنجری ذرات کو متحرک کرے۔ ایسا
انسان عقد ہمت سے جس وقت دست دعا اٹھائیگا
ایک امساک زدہ شہر کو باران رحمت تلے لے آئیگا+

بے تار خبر رسانی کی ماہیت اسی قدر ہے کہ دو مقام
پر خاص انداز سے ایک قسم کے برقی کھیت پیدا کر دیئے
جاتے ہیں۔ پھر جو آوازیں ایک کھیت میں اٹھتی ہیں وہی
دوسری جگہ سنی جاتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ جو بھی آواز پیدا
ہو اُسے ذرات کائنات محفوظ کر لیتے ہیں۔ وہ آواز ہر
مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اگر اس آواز کو ہوا کی بجائے
برقی رو سے پہنچایا جائے تو اس کی رفتار بہت تیز ہو جاتی

ہے۔ اس لئے بے تار خبر پہنچانے کے لئے مقام آواز پر برقی کھیت پیدا کر کے بہت جلد آواز کو پہنچا دیا جاتا ہے ہر مقام کے برقی ذرات اس آواز کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لئے جہاں چاہو کنڈکٹر کھڑا کر کے اس آواز کو کرہ ہوائی میں کی برقی رو سے لیلو اور ایک اُسی قسم کی برقی کھیت کے ذریعہ اُن آوازوں کو سن لو۔ آج ان باتوں پر تو ایک مغربیت زدہ آسانی سے ایمان لے آتا ہے۔ لیکن مخبر صادقؐ اور قرآن کے اس فرمانے پر انہیں اعتراض ہی رہا کہ روز محشر کو تمہارے منہ کی نکلی ہوئی آوازیں اور تمہارے ہاتھ پاؤں۔ آنکھ کان۔ تمہارے اعمال کی شہادت دینگے۔ آج گراموفون اور سائنا موٹوگراف نے ان باتوں کو محفوظ کر دیا ہے۔ آج وہ کام جو خدا اپنی قدرت کے ماتحت بیان کرتا تھا اسکے منوانے کے لئے قدرت کاملہ نے انسان کو ایک حد تک وہ راہیں سکھلا دیں۔ الغرض بے تار خبر کے اصول کو سامنے رکھکر واقعات اشراقیت کو سمجھ لینا کونسا مشکل امر ہے۔ دو صاحب دل دور دراز مقامات پر بیٹھکر اگر اپنے اندر ہی اندر برقی کھیت پیدا کر لیں تو پھر کیوں مشرق میں بیٹھا ہوا معلم

مغرب کے متعلم کو تعلیم نہ دے ؎

بدقسمتی سے ہم ہندوستانیوں میں ایک قسم کی ذہنی غلامی پیدا ہوچکی ہے۔ ہم ایک بات کسی اپنے ہموطن یا اپنے کسی متقدم کی سننے یا قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے لیکن اگر وہی بات کسی اہل مغرب کی طرف منسوب کر دی جائے یا یوں کہو کہ مغربی گراموفون میں سے سنائی دی جائے تو ہمارے لئے وہ کالوحی ہوجاتی ہے اس فطرت کا نام قرآن نے آیتہ افمن یمشی مکبا علی وجھہ میں ذہنی چوپائیت رکھا ہے۔ ایسے ذہنی چوپایوں کو ہم اطلاع دیتے ہیں کہ ٹیلی پیتھی اسی اشراقیت کا نام ہے جسے مغرب نے قبول کر لیا ہے۔ اسی طرح وہ آسیب زدگان مغرب جو کشف قلوب پر ہنس رہے تھے۔ آج اپنی ذہنی چوپائیت کے باعث اس کو تھاٹ ریڈنگ کے نام سے قبول کر رہے ہیں۔ یہ تھاٹ ریڈنگ (دوسروں کے خیالات پڑھ لینا) دو طرح سے ہوتا ہے۔ یا تو عامل اپنے کسی خیال کو معمول کے دل میں ڈال کر کہہ دیتا ہے کہ تمہارے دل میں یہ ہے یورپین تماشہ گر عموماً ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ یا بعض

وقت دوسرے کے خیالات کو واقعی پڑھ لیا جاتا ہے
جس اصول پر ہم نے بعض امور مندرجہ بالا کی تشریح کی ہے
اس کے مطابق یہ امر سمجھنا بھی اب مشکل نہیں رہا۔ آج السریز
کے ذریعہ تو ہم کسی جسم کی اندرونہ کو دیکھ سکتے اور اُس کی
بعض جسمانی کیفیات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ مگر اب ان
نقوش کا پڑھنا باقی رہ گیا ہے جو دل کی تختی پر ہر وقت دل
میں گذرنے والے خیالات منقش ہوتے جاتے ہیں۔ یہ بات
اُن لوگوں کو شاید جلدی سمجھ نہ آئے جو ذہن وادراک کو
جسم سے الگ چیز مانتے ہیں۔ لیکن جو ذہنیات کو جسم سے
نکلا ہوا مانتے ہیں اور قرآن کا یہی مذہب ہے جسے انشاءاللہ
ہم اپنے وقت پر بیان کرینگے۔ وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں
کہ ہر ایک خیال دماغ کے خانہ متعلقہ پر ایک نقش پیدا کر دیتا
ہے۔ جو کسی دوسرے خیال کے نقش سے بالکل جدا ہوتا
ہے۔ ہر ایک خیال ایک تصویر ہے جو لوح دل پر منقش ہو جاتی
ہے اس کا ایک ثبوت تو گراموفون کے ریکارڈ ہیں۔ مونہ
کے لفظ ہمارے خیال کی صوتی تصویر ہوتے ہیں۔ جنہیں یہ
ریکارڈ محفوظ کر لیتے ہیں۔ ریکارڈ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا

ہے۔ کہ ہر ایک لفظ دوسرے لفظ سے جداگانہ شکل رکھتا ہے۔ یہ تو ایک بالواسطہ مثال ہے لیکن بلا واسطہ تشریح اس امر کی کہ انسانی خیالات کا نقش جسمانیات پر ہوتا ہے کیفیت **حاضرات** کے سمجھنے سے ہو جاتی ہے۔ چیڑی (یا لاکھ) میں نہ صرف آواز کے نقوش جذب کرنے اور انہیں محفوظ رکھنے کی کافی طاقت ہے۔ بلکہ اس میں خیالات کو جذب کر کے بھی پوری قوت ہے۔ چنانچہ گراموفون کی تختی (ریکارڈ) جس مصالحہ سے بنتی ہے اس میں زیادہ حصہ اسی چیڑی کا ہے۔ حاضرات کے تماشہ کے وقت اسی چیڑی کو ایک ترکیب سے حل کر کے کسی کمسن کے ناخن پر لگا دیا جاتا ہے پھر جو خیال ایک عامل اس کے سر میں ڈالتا ہے اس کی تصویریں ناخن پر منقش ہو کر بچہ کو نظر آنے لگتی ہیں۔ عامل چھوڑ حاضرین میں سے بھی بعض کے خیالات بچے کے دماغ پر اپنی تصویریں بنا کر انہیں اس کے ناخن کی تختی پر منتقل کر دیتے ہیں یہ کیفیت چیڑی چھوڑ ہر روشن سیاہ چمکدار چیز کو بھی ناخن پر لگا دینے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ حاضرات کے تماشہ کی اصلیت ہے۔ اور اس معجزنما انگوٹھی اور ڈبیہ کا راز

ہے جو کچھ دنوں سے حاضرات کے متعلق کرامتوں کو بازار
تجارت میں لے آئی تھی۔ حاضرات کے اور تفصیلی کوائف
بھی ہیں لیکن ہمیں اس مثال سے صرف اسی قدر دکھلانا
تھا کہ خیالات کی تصویر بھی لی جا سکتی ہے اور ممکن ہے
کہ مزید تحقیق اس تصویر کو پائدار طریق پر محفوظ کر سکے۔ اور
بچہ یا کسی ناقص العقل کے سوا کوئی اور نہ بھی اس کو دیکھ سکے*

دماغ کے بعض خانے حافظہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

حافظہ خیالات اور ایسے ہی آواز کو بھی محفوظ کر لیتا ہے
سنی ہوئی آواز اور گذرا ہوا خیال مدتوں بعد کسی تحریک
پر ہمارے سامنے ایک تصویر کی طرح آ جاتا ہے۔ اس
حافظہ کی کیفیت کو گریموفون کا ریکارڈ اور حاضرات میں
بچہ کا ناخن سبہن کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ جو مصالحہ گریموفون
کے ریکارڈ میں آواز کو محفوظ کر لیتا ہے۔ دست قدرت
نے اسے ہی حافظہ کے خانوں میں رکھ دیا ہو۔ جیسے بڑی ہی
عموماً نقش حاضرات کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ ممکن ہے
کہ اسی قسم کا مصالحہ حافظہ کے ان خانوں میں بھی ہو جو خیال
کو محفوظ رکھتے ہیں۔ فوٹوگراف کے مصالحہ کے اجزا انسان

نے آنکھ کے پردوں کو زیر تحقیق لا کر دریافت کیئے ہیں آنکھ کے جس پردہ پر بیرونی چیزوں کا عکس پڑتا ہے اُسی کے تحلیل و تجزیہ نے ہمیں اُس مصالحہ کا پتہ دیا جس سے فوٹوگراف کے شیشے تیار ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ حافظہ کے خانوں کے اجزاء دوسرے دماغ کے خانوں کے اجزاء سے الگ ہیں۔ کیونکہ ہر ایک خانہ کا فعل الگ الگ ہے۔ لہذا اگر دماغ کے خانہ حافظہ کو زیر تحقیق لایا جائے اور ساتھ ہی اُن خوراکوں کے اجزاء پر بھی غور کیا جائے جو ممد حافظہ ثابت ہوئی ہیں اور ان کے ساتھ اس جیسٹری (لیتھے لائف) کو بھی سامنے رکھا جائے تو بہت جلد گرموفون کی تختی کی طرح اُس تختی کے بنانے کا مصالحہ بھی معلوم کرلیں گے کہ جس پر کسی دیکھنے والے کے خیالات منقش ہو کر آیندہ پڑھے جاسکیں۔ اس امر سے یہ بات بھی حل ہو جاتی ہے کہ تخیلات و تصوّرات یا بالفاظ دیگر ادراکات کا صعود جسم سے ہوا۔

اس بحث سے مغربی کشف قلوب (تھاٹ ریڈنگ) کی حقیقت آسانی سے سمجھ آجاتی ہے جن ذرات کی

کی ترکیب سے اکسہیز پیدا ہوکر انسان پر حسنًا کشف صدور ہوجاتا ہے۔ وہ ذرات انسانی جسم میں تو موجود ہیں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ تو پھر اگر کسی کی قوت ارادی کامل نشوونما پاکر ان ذرات سے اکسہیز پیدا کرلے تو ایک کی چشم باطن دوسرے کے خیالات لازمًا پڑھ لیگی۔ بالمقابل جس اصول پر حاضراتیہ ایک عامل اپنے خیالات کی تصویر کو بچے کے ناخن پر لانے سے پہلے انہیں اس کے دل ودماغ پر مرتسم کر دیتا ہے اسی طرح ایک شخص اپنے ہی خیالات دوسرے کے سینہ میں ڈال کر بتلا دیتا ہے کہ تمہارے دل میں یہ گذر رہا ہے۔

لیکن کسی دوسرے کے سینہ کے پڑھ لینے کا ایک تیسرا بھی ذریعہ ہے۔ جو علیم بذات الصدور کی کامل عبودیت سے کسی انسان کو معلوم ہوجاتا ہے۔ قرآن نے خدا تعالےٰ کی شان میں لطیف۔ علیم اور خبیر کہکر ہمیں اطلاع دی کہ انسان کے سینہ یا دل کی تہ میں کوئی خیال ہو وہ علیم ولطیف خدا کے علم میں ہوتا ہے۔ اگر انسان صبغۃ اللہ اختیار کرکے ربانی مظہریت کا جامہ پہن سکتا ہے۔ تو وہ بھی علیم و

لطیف خدا کے سایہ تلے حسب ضرورت دوسروں کے سینوں کا بھید معلوم کر سکتا ہے۔ الغرض کشف صدور کے یہ تین طریقے انسانی اکتساب میں آسکتے ہیں۔ ایک سائنٹفک طریق ہوگا۔ دوسرے کا نام عمل الترب رکھا جا سکتا ہے۔ تیسرے کا موزوں سے موزوں نام صبغتہ اللہ ہو سکتا ہے۔ اسلام نے پہلے اور تیسرے طریق کو پسند کیا ہے۔ دوسرے طریق میں جو خطرات ہیں اُنہیں اوپر ذکر کر دیا گیا ہے۔ میرے نزدیک ہر امر کے حاصل کرنے کے یہ ہی تین طریقے ہو سکتے ہیں۔ کسی بیمار کا علاج ادویات کے ذریعہ ہو۔ یا مسمریزمی توجہ سے ہو۔ یا کوئی مرد خدا خدائے حکیم وشافی کے رنگ میں رنگین ہو کر کسی مریض کو اپنی توجہ اور دعا سے اچھا کر دے۔ امر دوم وسوم کو بعض حالات میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بہت سے عمل الترب کے مشاق ولایت کے لباس میں دوسروں کو نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک آسان تمیز یہ ہے کہ صبغتہ اللہ والے لوگ ان امور کے مدعی نہیں ہوتے جس بات کو ایک عامل الترب نے مشق سے مکمل کر لیا ہے وہ اُن میں استعداد

موجود ہوتی ہے۔ وہ بات وقت پر توجہ اور دعاء کے ماتحت اُن سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور حق الامر بھی یہی ہے کہ جو باتیں سائنٹفک طریق پر انسان حاصل کر لے انہیں عمل الترب کے ذریعہ حاصل کرنا کوئی بلند نصب العین نہیں خصوصاً جب اسکے سبب سے تخریب اخلاق بھی ہو۔ ان چیزوں کا کسی میں موجود ہونا ولایت کا ثبوت نہ سمجھنا چاہئیے۔ اُس کا معیار وہ مکارم اخلاق ہیں جو اولیاء اللہ کی زیب و زینت ہوا کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے قریب قریب اُن سب باتوں سے ہمیں اطلاع دی ہے جنہیں آج انسان نے ایک نہ ایک طریق پر حاصل کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہوا میں اُڑنا کسی کی نگاہ میں کسی کا کچھ کا کچھ کر دکھانا۔ بیجان اجزاء کو ترکیب دیکر اُن میں جانداروں کی سی نقل و حرکت پیدا کر دینا۔ کالمیت چیزوں کو زندہ کر دینا۔ زمین کے دفینوں کو دیکھنا وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں انسانی اکتسابات ہیں۔ اور سائنٹفک طریق پر بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ الغرض ہم جو چاہیں اگر شان خداوندی اور اس کے مقتضیات اوس کے مخالف نہیں تو وہ ہو سکتا ہے۔ میرا تو یہانتک ایمان ہے۔ کہ جن چیزوں

کو خدا تعالیٰ نے روک دیا ہے۔ ان کے علاوہ باقی کوئی بھی چیز ہو انسان اُسے حاصل کر سکتا ہے وآتٰکم من کل ما سألتموہ (جو کچھ اُس سے مانگو وہ دیتا ہے) کا وعدہ ہر انسانی خواہش جائز کے پورا ہونے کے متعلق ہے یعنی جو کچھ بھی میرے دل میں آئے یا جس کے متعلق سوال ہو سکے یہ آیت اُس کے ملنے کا وعدہ دلاتی ہے پھر جس مقام پر یہ وعدہ ہے اس کے سیاق سباق میں زمین و آسمان و ما فیہا کا ذکر کر کے یہ اشارہ کیا جاتا ہے کہ اشیائے مسئولہ کے حصول کے اسباب کائنات میں موجود ہیں۔ تم انہیں تلاش کرو۔ وہ سائنٹفک طریق پر حاصل ہو سکتے ہیں اشیائے کائنات میں ایک قسم کے خواص ہیں کہ جن کے ماتحت ہر ایک مطلوبہ چیز پیدا ہو سکتی ہے۔ ہاں خواص الاشیاء کا علم حاصل کرو۔ یہ کس قدر زبردست خوشخبری ہے۔ جو انسان کو علمی تحقیقات کے دروازہ پر لا کر اس کی ہر خواہش کو پورا کرا دیتی ہے۔ پھر ساحران موسیٰ کا ذکر کر کے ہمیں یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ جو باتیں سائنس پیدا کرتی ہے انسانی توجہ بھی بعض وقت انہیں پیدا کر لیتی ہے۔ ہاں ان دونو باتوں پر

ربانی علوم غالب آتے ہیں جو کسی انسان پر اسمائے الٰہیہ کی پرستاری ہیں کھلتے ہیں اُن کے وارث انبیاء یا اُن کے سچے متعلقین ہوتے ہیں +

اس مقام پر ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ انسان کی ضروریات اُس کی دلچسپیاں یا اس کی عجائبات پرستیاں ان سب کو ذرات عالم کی مختلف ترکیبیں ہی پورا کر دیتی ہیں یہ تراکیب مختلفہ خواہ سائنٹفک جدوجہد کا نتیجہ ہو یا عمل الترب کی بوالعجبیاں ہوں یا صبغتہ اللّٰہی اعجاز ہو ان سب ہیں ایک چیز مشترک ہے۔ وہ انسان کا قلب اس کی قوت ارادہ اور توجہ ہے ایک طبیب۔ یا ایک ماہر علم الترب۔ یا ایک مرد خدا تینوں کے تینوں توجہ اور ارادے سے ہی کام لیتے ہیں۔ ان تینوں کے ارادوں کے ماتحت ذرات عالم آجاتے ہیں۔ اور یہ تینوں ان سے خدمت بھی لے لیتے ہیں۔ اگر ہم امر دوم کو مکروہ و مذموم سمجھتے ہیں تو اس لئے کہ اس ہیں عامل اپنے اندر مخلوقات سفلیہ کے قوی پیدا کر کے اپنے ہیں ادنی احیوانات کی خو بو بھی پیدا کر لیتا ہے جیسے ہم نے اوپر مفصل بیان کیا ہے۔ ....

والا ان تینوں میں مشارکت ضرور ہے۔ یہ امر بظاہر ایک قسم کا اجتماع ضدین ہے۔ اور شاید یہ امر بھی بعض کو نرالا معلوم ہو کہ کیوں اسمائے الٰہیہ کی پرستاری ہمیں اس قابل کر دیتی ہے کہ ہم کائنات پر اُسی طرح حکم کر سکیں جس طرح سائنس یا عمل الترب کرتا ہے۔ اس کی حقیقت اس رشتہ سے کھل جاتی ہے۔ جو کائنات میں اور اسمائے الٰہیہ میں موجود ہے اس حقیقت کی آشنائی سے نہ صرف یہ معمہ ہی حل ہو جائیگا بلکہ یہ امر بھی سمجھ میں آجائیگا کہ کیوں خدا تعالےٰ نے ایمان بالتوحید کو ہی ہر قسم کی تہذیب و تمدن اور سب سے بڑھکر تکمیل نفس انسانی کا ذریعہ ٹھیرایا۔ اور جو اُس کی طرف سے آیا وہ کیوں صرف لا الٰہ الا اللہ ہی پر زور دینے آیا۔

ذرات عالم پر ان ہر سہ طریق بالا میں انسان کی حکومت دراصل ادراک انسانی کی حکومت ہے۔ اگرچہ یہ حکومت نہایت ہی ناقص اور محدود ہے دراصل یہ حکومت تو اُس ادراک اعظم کی حکومت کا ایک خفیف سا عکس یا ظل ہے جو خالق اور مالک ہونے کی حیثیت میں ہر ذرہ سے خراج اطاعت لیتا ہے ولہ اسلم من فی السموٰت والارض طوعًا و

كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ زمین اور آسمان اور جو کچھ ان میں ہے اس کے حکم کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ انہیں اسی طرف لوٹ جانا ہے)
اگر ادراک انسانی ادراک الٰہیہ کی ایک چھوٹی سی تصویر ہے اور یہ یاد رہے کہ ادراک انسانی ہی وہ چیز ہے جس سے کوئی ربانی رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کو خدا کی مظہریت اختیار کرنا ہے۔ تو جن طریقوں پر یا جن وجوہ سے ادراک اعظم ذرات عالم پر حکومت کر رہا ہے اسی رنگ میں ادراک انسانی کی حکومت کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔ اس ادراک اعظم کی اگر کوئی حقیقت ہم سمجھ سکتے ہیں تو صرف ان ہی صفات کی حقیقت کے سمجھنے سے جنہیں ہم صفات باری کہتے ہیں ادراک اعظم گویا ان صفات کے مجموعہ کا نام ہے۔ ادراک انسانی میں ان صفات کی حصول کی استعداد موجود ہے۔ اگر وہ صفات حسب استعداد انسانی قلب میں پیدا ہو جائیں تو پھر ادراک انسانی ادراک اعظم کا ظل یا عکس بن جائیگا۔ لہٰذا اگر ادراک اعظم کی حکومت ذرات پر حقیقی اور اصلی ہے تو تربیت یافتہ ادراک انسانی کی حکومت ایک ظلی حکومت ہو جائیگی۔ یہ حقیقت مظہریت ہے۔ قلب انسانی کو جو عرش عظیم یا تخت خداوندی کہا گیا ہے۔ تو

اُس کی حقیقت بھی یہی ہے نفس انسانی کی جولانگاہ دماغ نہیں جیسے کہ اہل مغرب کا خیال ہے بلکہ قلب ہے۔ یہی نفس آہستہ آہستہ تہذیب پاتا ہوا جب حکومت جذبات سے نکل کر نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ تو اس کی صفات۔ صفات الٰہیہ کا عکس ہو جاتی ہیں۔ اسی کو قرآن نے قلب سلیم کہا ہے قلب سلیم ہی دراصل تجلّیات الوہیت ہو کر صاحب قلب کو صبغۃ اللہ بنا دیتا ہے۔ اب یہ امر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ کیوں قلب انسانی ایسی توجہ اور ارادہ اپنے اندر رکھ سکتا ہے۔ کہ جس سے وہ ذرات عالم پر حکومت کر لیتا ہے۔ سمجھنے کو تو یہ بات بہت آسان ہے لیکن ایک متشکک کی تشفی کے لئے شائد اس راز کو کسیقدر کھول دینا مفید ہو گا۔ کہ صفات الٰہیہ کو ذرات عالم سے کیا تعلق ہے +

پیشتر ازیں کہ ہم نفس مضمون کی طرف آئیں ہم قارئین اوراق کی توجہ اس حکومت کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں جو ادراک انسانی کو کل جسم پر حاصل ہے۔ رنج و راحت یا غم و خوشی کے خیال جو اثر جسم پر ڈالتے ہیں وہ ظاہر ہے۔ چہرہ کی رنگت۔ آنکھوں کی کیفیت بلکہ چہرہ کا ہر خط و خال ایک

تجربہ کار کی نگاہ میں دوسرے کی قلبی کیفیت کا آئینہ ہوتا ہے
اب یہ جسم پر انسانی ادراک کی حکومت نہیں تو اور کیا ہے
مضبوط تخیل والا سردی اور گرمی پیدا کرنے کے اسباب
کے بغیر ہی سردی میں گرمی اور گرمی میں سردی محسوس کر سکتا
ہے اگر وہ تخیل سے کام لے۔ سلب امراض کا یہی بڑا بھاری
راز ہے۔ مریض کی توجہ کو مرض سے پھیر لینا اُس کے قلب میں
یقین صحت بڑھا دینا اُس میں وہ طاقت پیدا کر دیتا ہے
کہ جس کے ماتحت ادویات کے بغیر خود طبیعت مرض پر
غالب آجاتی ہے۔ اس انعطاف توجہ یا یقین کے پیدا
کرنے کے لئے مریض کا مدرکہ ان حالات کے قیاس و
خیال مخالف سے خالی ہونا چاہئے۔ گویا ہمیں اُس سے
خوف مرض نکال کر اس کے بجائے امید شفا بھر دینا ہے
پھر یہ امید طبیعت کو مضبوط کر کے سلب مرض کر دیگی۔ یہی
وجہ ہے کہ زود یقین معمول جلدی فائدہ اُٹھا لیتے ہیں
آجکل کے بعض ولایت فروش جو مریدیں حسن اعتقاد کی شرط
لگاتے ہیں اُس کی حقیقت بھی یہی ہے۔ ہپناٹزم کا راز
بھی اسی قدر ہے۔ مریض بے ہوش ہو کر اپنی لوح مدرکہ کو ہر قسم

کے خیال سے صاف کرلیتا ہے۔ پھر عامل جو چاہے اُس تختی پر نقش ڈال دے۔ اس حالت میں جو ہدایت دیجائیگی اُسے معمول قبول کرکے اُس ہدایت کی منشاء کے مطابق ہوش آنے پر عامل ہوجائیگا۔ الغرض یہ ساری باتیں اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ نفس مدرکہ کس قدر زبردست حکومت جسمانیات پر رکھتا ہے۔ کسی معاملہ میں اس حکومت کی کمی بیشی اُس یقین و اعتبار کے مطابق ہوگی۔ جو نفس مدرکہ کو خود اپنے متعلق ہو۔ چھوٹے چھوٹے امراض اور معمولی غموم وہموم سے انسان صرف خیال کے بدلنے پر آزاد ہوجاتا ہے ہچکی کا ایک علاج یہی خیال کا بدلنا ہوتا ہے۔ الغرض کسی تکلیف کے مقابل ایک اور خیال کا پیدا کرنا اور اُس خیال کو مضبوط کرنا۔ اُس تکلیف کے دفعیہ کے لئے کافی ہوسکتا ہے +

مغرب میں آج فرقہ کرسچین سائنس اسی حقیقت سے پیدا ہوا ہے۔ یہ لوگ ہر تکلیف کے وجود سے انکار کرنا اپنا جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ یعنی کسی تکلیف کے مقابل میں جو ایک راحت ہے صرف اسکے وجود پر اُن کا ایمان ہوتا ہے۔

تکلیف ان کے نزدیک دراصل امرِ معدوم ہے ۔ اُن کی رائے یہ ہے کہ تکلیف کا خیال انسان کی غلطی خیال نے پیدا کر دیا ہے ۔ اس لئے اُن کی تعلیم یہ ہے کہ ہم کسی تکلیف کا علاج نہ کریں بلکہ اس تکلیف کے وجود سے انکار کریں اور اُس کے مقابل جو راحت ہو اُس کے وجود پر یقین بڑھائیں تو اُس سے وہ تکلیف دور ہو جائیگی ۔ مثلاً دنیا میں جس کا نام بیماری ہے اُن کے نزدیک وہ کوئی چیز نہیں ۔ ہمارے چاروں طرف شفا ہی شفا ہے ۔ اس لئے بیماری کے پیدا ہونے پر اُس کا علاج کرنا اس بیماری کے وجود کو تسلیم کر لینا ہے ۔ علاج یہی ہے کہ ہم کوئی دوائی نہ کھائیں ۔ اور یہ یقین کر لیں کہ بیماری امرِ موہوم ہے ۔ اور ہمارے چاروں طرف صحت ہی صحت ہے ۔ اسی طرح افلاس ۔ بدصورتی ۔ بھی امورِ موہومہ ہیں ۔ ہمارے اپنے خیالات نے ان کو پیدا کر دیا ہے ۔ دنیا میں چاروں طرف دولتمندی اور خوبصورتی ہے ۔ اس لئے افلاس و بدصورتی سے بچنا اسی میں ہے کہ ہم وجودِ بدصورتی و افلاس سے تو انکار کریں اور غناء و جمال کے وجود پر ایمان لائیں ۔ یہ متقابلہ انکار و ایمان ہم میں خوبصورتی اور

دولتمندی پیدا کر دیگا۔ یہ نئی سوفسطائیت جواب مغرب میں پھیل رہی ہے۔ اس کی بیہودگی تو عیاں ہے۔ لیکن جو اس میں حقیقت ہے وہ وہی قوت یقین و ارادہ ہے۔ جس پر ہم بحث کر آئے ہیں جس کے مضبوط ہونے پر ایک طرف اس کے خلاف خیالات سر سے نکل جاتے ہیں جس کا اثر لازماً جسم پر ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ یقین قوت عمل کو مضبوط کر کے انسان کو اپنے مطلوب چیز کے قریب لے آتا ہے کرسچین سائنس کے ان معتقدات کی حقیقت کا ثبوت اگر ان کی طرف سے کبھی پیش ہوتا ہے تو صرف بیماری کے معاملہ میں ہوا ہے۔ اس طریق پر مریضوں کے اچھے ہونے کی چند مثالیں تو وہ دید ینگے۔ لیکن کسی بدصورت کا اس طریق پر خوبصورت ہو جانا وہ ثابت نہیں کر سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک مفلس ایسا خیال کر کے افلاس سے بچ گیا ہو۔ کیونکہ قوت یقین قوت عمل کو مضبوط کر دیتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس یقین کے ساتھ کہ افلاس دنیا میں کوئی چیز نہیں میدان عمل میں آجائے تو ضرور ہے کہ افلاس سے نجات پائے۔ ان واقعات کو سامنے رکھنے سے ایک ہی بات

طے ہوتی ہے کہ نفس مدرکہ کا جسم پر کس قدر اثر ہے +
یہ کرسچین سائنس دراصل ایمان بالتوحید کا ایک
دھندلا سا عکس ہے۔ یہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ دراصل
لا الہ الا اللہ کے ذکر و فکر میں عملاً لگے ہوئے ہیں۔ یہ امر تو
بالکل غلط ہے کہ بدی یا تکلیف کا کوئی وجود ہی نہیں۔ خیر و شر
دو حقیقتیں ہیں اور اگر غور کرو تو ایک کا وجود ہی دوسرے
کے وجود کا ثبوت ہے۔ ایک کا تعقل دوسرے کے تعقل
کو پیدا کر دیتا ہے۔ صحیح مسئلہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی انسان کے
لئے پیدا ہوا ہے اور جس کے اسباب خدا نے پیدا کئے
ہیں وہ خیر ہی خیر ہے۔ ہاں اسباب کا خیر کے مٹ جانے
سے اُس کے اُلٹ شر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے جب
کوئی شر پیدا ہو تو تم دفعیہ میں اُن اسباب پر غور کرو۔ کہ جن کے
ٹلنے یا پیدا ہونے پر پھر خیر پیدا ہو جائے۔ اس حقیقت کو
اسلام نے لا الہ الا اللہ میں تلقین کیا ہے۔ تم غور کر کے دیکھ
لو۔ دنیا کی کوئی بیماری یا کوئی تکلیف ایسی نہ پاؤ گے جو
کسی اسم حسنیٰ کی نقیض نہ ہو۔ ایک کرسچین سائنٹسٹ
جہاں افلاس یا بیماری یا بدصورتی کے دور کرنے کیلئے

ان کے وجود سے انکار کرکے غنا۔ شفا اور جمال کا تصور باندھتا ہے۔ ایک موحد لا الہ الا اللہ کا ذکر کرکے صفات مغنی۔ شافی اور جمیل کو اپیل کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان تین صفات کے جو نقیض ہونگے اُن ہی سے افلاس بیماری اور بدصورتی پیدا ہوئی ہے۔ ذکر لا الہ الا اللہ میں وہ ان اسباب کی نفی اور ان تین صفات کا اثبات کرتا ہے۔ اب کونسی بدی یا تکلیف انسانی خیال میں آسکتی ہے جس کے الٹ خدا کی کوئی صفت حسنہ واقع نہ ہوئی ہو۔ ذکر لا الہ الا اللہ کو جیسے ہم کتاب التوحید فی الاسلام میں واضح کہہ چکے ہیں۔ اگر دیگر اذکار پر ترجیح ہے تو اس لئے کہ لا الہ الا اللہ کہکر ہم ہر ایسی بدی یا تکلیف کی نفی کرگذرتے ہیں اور اُس کے الٹ ہر ایسی صفت الٰہیہ کا اثبات کرتے ہیں کہ دنیا کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ہاں کرسچین سائنٹسٹ کا رنگ مشرکانہ ہے۔ اور ہمارا رنگ موحدانہ۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ پرانے یونانی اور ہندیوں کی طرح خیر و شر کی مختلف شکلوں کو مختلف وجود دیکر خیر کے مختلف وجودوں کو معبود بنا لینگے۔ چنانچہ اب بھی جب ایک مسلمان کسی

تکلیف کے دفعیہ کے لئے اُس کے متقابل صفت حسنہ پر غور و فکر کرتا ہے۔ یہ لوگ اُس تکلیف کے الٹ چیز کو اپنی توجہ میں لاکر اُس سے استمداد کرتے ہیں۔ خواہ کچھ ہی ہو۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ عیسائیت کے پنجہ سے نکل کر یہ لاالہ الا اللہ کے قریب آگئے ہیں۔ یہ خدا کے وجود کے قائل ہیں۔ ایک مسلمان متکلم جب اُن کے سامنے اسمائے الٰہیہ مندرجہ قرآن کا نظام پیش کریگا اور ذکر لا الہ الا اللہ میں اُنہیں نفی و اثبات کا راز بتلائے گا تو خدا چاہے اس گروہ میں سے بہت سی سعید روحیں نکل آئینگی ؂

اس بحث سے ہماری مراد صرف اسی قدر دکھلانا تھا کہ انسانی نفس مدرکہ کی کس قدر حکومت انسان کی جسمانیات پر ہے۔ گذشتہ تین چار سال کے انکشافات نیورالاجی نے تو ایک زمانہ کو حیران کر رکھا ہے۔ نیورالاجی سے مراد علم عصبات ہے جیساکہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ یہ امر تو مسلم ہے کہ کل اعصاب و رگوں کی جڑ دماغ میں ہوتی ہے اور یہ وہیں سے دماغ جسم کے ہر حصہ پر حکومت کرتا ہے۔ ہر مرض کے متعلق اس علم کے ماہر سب سے پہلے یہ تحقیق کرتے

ہیں کہ آیا وہ مرض کسی عصب یا عضلے کے عمل ہیں فرق آنے سے پیدا ہوئی ہے یا وہ عضلہ و عصب بذات خود ماؤف ہو چکا ہے مثلاً ایک شخص کا اپنی بصارت کا کھو دینا یا تو اعصاب چشم کے ماؤف ہونے سے تعلق رکھتا ہے یا اُن کے عمل ہیں فرق آنے سے ایسا ہوتا ہے۔ اب اگر ان کی تحقیق ہیں یہ آجائے کہ شخص خاص کی نابینائی کا موجب کسی عصب کا نقص عمل ہے تو وہ کسی دوائی سے علاج نہیں کرینگے وہ مریض کو اپنے پاس رکھکر اس کے ساتھ ایسی باتیں کرینگے کہ جس سے اس کے دماغ ہیں ایک ہیجان پیدا ہو۔ اور جوش ہیجان سے نظام عصبانت ہیں کچھ ایسا تحرک ہو کہ جس سے عصب متعلقہ اپنے چھوڑے ہوئے عمل کو اختیار کرلے ان باتوں کے کرنے کا نام ان کی اصطلاح ہیں سجیسشن (اشارات) ہے۔ یورپ کی جنگ نے سپاہیوں کو رات دن کے میدان گولہ باری ہیں رکھکر اُن کے پٹھوں کو کہیں ماؤف کیا۔ کہیں اعصاب اپنا کام دینے سے رہ گئے جس سے نئی نئی قسم کی بیماریاں پیدا ہوگئیں۔ چنانچہ ایک سپاہی ایک دن اپنے بستر سے اٹھتا ہے اور اپنے آپ

کو گونگا پاتا ہے۔ اُس کے متعلق طبی رائے یہ ہوئی کہ اعضائے تکلم میں تو فرق نہیں آیا۔ لیکن عصبات تکلم توپوں کی آواز سے دب کر اپنا عمل چھوڑ بیٹھے۔ اس لئے اُسے ہسپتال نیورالاجی میں لایا گیا۔ اور اس کے سامنے ایسے قول و فعل کئے گئے کہ جس سے اُس کی قوتِ غضب و اشتعال جوش میں آجائے اور وہ طبعاً اُن امور کو روکنے کی کوشش کرے۔ لیکن ساتھ اُس کے حالات ایسے کر دیئے گئے کہ وہ اپنے ارادہ مخالفت کو ہاتھ یا پاؤں کے ذریعہ پورا نہ کر سکے۔ سوائے اسکے اُسکے پاس کیا چارہ تھا کہ وہ بولنے کی کوشش کرے۔ مختلف اقسام اشتعال میں اس کے سامنے کر دیئے گئے۔ آخر ایک امر سے اس کا سارا جسم مارے غصہ کے بید لرزاں ہو گیا اور جوش میں آکر اس کی زبان گویا ہو گئی۔ مارچ ۱۹۱۹ء کے اخبار سنڈے ٹائمز میں ایک آرٹیکل بعنوان معجزات جدید نکلا۔ اس کا لکھنے والا مڈلینڈ کے ہسپتال عصبات کا ایک مشہور ڈاکٹر تھا۔ اُس میں بعض مریضوں کے اس طریق پر شفا پانے کے حالات درج تھے۔ ایک پندرہ سولہ سالہ اندھے کا بصارت حاصل کر لینا۔ ایک چند سالہ لنگڑے کا

کے ثبوت ہیں یہ کہنا ہے کہ اندھے بینائی پا رہے ہیں۔ بہرے سن رہے ہیں۔ اور لنگڑے چنگے ہو کر چل رہے ہیں اُس وقت جناب مسیحؑ کا یہ کہنا شاید نتیجہ خیز ہوا ہو۔ گو بائیبل کے پڑھنے سے ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن آج اگر ایک مڈلینڈ کا ڈاکٹر کھڑے ہو کر یہ کہے۔ توبہ کرو! توبہ کرو! خداوند کی بادشاہت قریب ہے۔ اُس کے لئے تیار ہی کرو۔ اور اس کا یہ ثبوت ہے کہ آج (ایک) ابن آدم کے ہاتھ سے لنگڑے چل رہے ہیں۔ بہرے سن رہے ہیں اور اندھے بینائی پا رہے ہیں،" تو ڈاکٹر موصوف کی یہ باتیں سن کر لوگ اتنا کہکر اعراض کر دینگے کہ یہ ڈاکٹر خود پاگل خانہ میں جانے کے قابل ہے۔ اس کا دماغ خود کامیابی سے پھر گیا ہے۔ بہتر ہے کہ یہ اپنا علاج پہلے آپ کرے۔ ع

شاد باش اے مرگ۔ عیسےٰ آپ ہی بیمار ہے

کیا عجب زمانہ آگیا ہے جو ہر ایسے مذہب کا دیوالہ نکال دیگا جس کی پونجی بانی مذہب کے چند معجزات ہوں۔ آج یہ بھی سمجھ آتی ہے کہ کیوں قرآن نے ایسے معجزات کی جگہ اکثر بینات یعنی معجزات عقلیہ پر زور دیا ہے۔ اور اس معجزنما تبدیلی

اخلاق کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جو قرآن کی تعلیم نے عرب میں پیدا کر دی۔ اس اخبار کے پڑھنے کے چند ہفتے بعد میں جہاز میں ہندوستان آنے لگا۔ جہاں میرا رفیق سفر ایک بڑے پایہ کا پادری تھا (غالباً یو گنڈا کا آرچ ڈکن) میں نے اُس سے ان معجزات جدیدہ کا ذکر کر کے اشارہ کیا کہ اب تو مذہبی اعتقادات میں بہت سی مخل باتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں اور اُن مذاہب کا اب کیا حشر ہو گا جن کی بنیاد ہی از قبیل معجزات پر ہو۔ میرے اشارے کو وہ سمجھ گیا۔ اور جھٹ کہنے لگا کہ مسیح کا بڑا معجزہ تو وہ عظیم الشان تبدیلی اخلاق ہے جو لوگوں میں اُسے قبول کرنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سن کر مجھے دل میں تو از حد خوشی ہوئی۔ کہ آخر یہ لوگ بھی اس معاملہ میں قرآن کے قدم پر چلے۔ جہاں انکار معجزات قدیمہ بھی نہیں کیا گیا۔ اور اس قسم کے معجزات کا ظہور بھی ہوا لیکن جس معجزہ پر قرآن مجید نے زور دیا وہ وہ تبدیلی عادت و اخلاق ہی ہے جو اعجازی طور پر عرب میں قرآن کریم کے ذریعہ ہوئی۔ ابھی چند سال پہلے جس بات کو یہ لوگ اعتراضاً اسلام کے خلاف پیش کرتے تھے۔ آج مجبوراً اُسے ہی اختیار

کرنے لگے۔ میں نے متبسمانہ لہجہ اختیار کر کے انہیں یہ کہا
کہ یورپ کے کس گوشہ میں میں اس معجزہ تبدیلی اخلاق کی
تلاش کروں۔ اس پر وہ سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا تھا
کہ یورپ تو عیسائی نہیں رہا۔ میں نے عرض کیا کہ وہ کب
تھا کیونکہ ایام وسطی کا طریق عمل آپ کے نزدیک صحیح نہیں
بات کو کاٹ کر وہ کہنے لگا کہ میں یوگنڈا میں کام کرتا ہوں
جہاں لوگ معمولی انسانی اخلاق سے بھی معرا ہیں۔ لیکن جب
وہ مسیح کو قبول کرتے ہیں تو اُن میں اچھے اخلاق پیدا ہونے
لگ جاتے ہیں میں نے عرض کیا کہ جو بات آپ تجربتاً کہتے
ہیں وہ صحیح ہوگی۔ لیکن یہ بات تو آپ کو بھی ماننی ہی پڑیگی
کہ اگر قبولیت مسیح اخلاقی انقلاب کر دیا کرتی ہے تو یورپ
میں غالباً وہ ابتدائی ایام عیسائیت ہونگے کیونکہ ایام وسطی
اور ایام موجودہ میں تو یورپ عیسائیت سے معرا ہے۔ اُسے
سوا تسلیم کے کوئی اور چارہ نہ تھا جبپر میں نے ذیل کی بات
کہی اور جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں سے چل دیا تاکہ وہ کھسیانا
ہو کر مجھ سے بیزار ہی نہ ہو جائے۔ اور جو آئندہ ایام سفر جہاز
میں میں اُس سے گفتگو کرنا چاہتا تھا وہ بند نہ ہو جائے۔

میں نے کہا کہ آپ کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے جس وقت یورپ نے عیسائیت قبول کی اُس وقت وہاں یہ تمدن وتہذیب ہی نہ تھی۔ مسیح کو قبول کرکے وہ اچھے ہوگئے ہونگے لیکن تہذیب کے پیدا ہونے پر وہ بگڑ گئے۔ یوگنڈا کے لوگ بھی ابھی ابھی تہذیب سے دور ہیں۔ وہ بھی زیادہ مہذب ہوکر یورپ کے قدم بقدم چلنے لگیں گے۔ آخر ذولو اور کافر لوگ (باشندگان جنوب ومشرقی افریقہ) عیسائی ہوکر وحشیانہ حالت سے نکل گئے۔ اور کچھ دیر بعد۔ شراب۔ قمار بازی۔ اور زنا۔ جو تہذیب یورپ کی لعنت ہے اُن کے حصہ میں آگئی۔

اس ساری بحث سے مجھے یہ دکھلانا منظور تھا کہ نفس انسانی قلب یا نفس مدرکہ کا اثر اور حکومت اُن ذرات پر ہے جس سے انسانی جسم نے ترکیب پائی ہے۔ اگر قوت ارادی انسان کی بڑھ جائے یا بالفاظ دیگر نفس مدرکہ کی پوری حکومت جسم پر ہو جائے۔ تو پھر عجیب وغریب کرشمے انسان سے ظاہر ہوں۔ یہ امر بھی اب پایۂ ثبوت تک پہنچ گیا کہ انسان کی توجہ اور ارادہ ان ذرات پر بھی حکومت کرتا

ہے جو دوسرے کے جسم میں ہوں یعنی ایک انسان دوسرے انسان کے دل و دماغ پر اپنے تاثرات بٹھا سکتا ہے۔

انسانی قلب کی تیسری حکومت ان ذرات عالم پر ہوگی جو کسی ذی روح جسم سے باہر ہیں۔ چلتی گھڑی کو توجہ سے کھڑا کر دینا سننے میں آیا ہے۔ میز کے گرد چند آدمیوں کا جمع ہو کر اس پہ ہاتھ رکھنا۔ پھر اس کے ایک پاؤں کا خود بخود اٹھ جانا۔ اور مجوزہ طریق عمل پہ میز کا کئی دفعہ قدم اٹھانا اور رکھنا جسے توہم پرست کسی روح کے آنے کا نشان بتاتے ہیں۔ یہ سب وہی توجہ اور قوت ارادی ہے جو میز پہ حکومت کرتی ہے۔ یہ صحیح امر ہے کہ عامل میز کو کوئی حرکت نہیں دیتا لیکن یہ بھی صحیح بات ہے کہ اس کے سانس لینے کو اس سے تعلق ہوتا ہے۔ بعض وقت وہ جتنی مرتبہ دم لیگا اتنی ہی دفعہ میز اٹھیگی۔ لیکن میں تو اس بات کو مانتا ہوں کہ کامل توجہ قوت ارادی میز کو ہلا سکتی ہے۔

اسی حکومت نفس بر جسمانیات کا ایک طریق تو وہ ہے جسے ہم نے عمل الترب کہا ہے لیکن حقیقی حکومت نفس مدرکہ کو جسمانیات پر اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ جب

وہ خود جسمانیات کی حکومت سے نکل جائے۔ اور پھر جسمانیات کے مختلف ہیولوں کی نیچر سے اس کی نیچر کو ایک قسم کا تعلق پیدا ہو جائے کہ جس سے وہ ہیولے طبعاً اسکی اطاعت کریں۔ عمل الترب کے ماتحت اگرچہ انسان اپنے نفس مدرکہ میں عالم سفلی کے وہ مدرکات پیدا کر لیتا ہے کہ جن سے قوائے مطلوبہ تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اس سے وہ خود محکوم جسمانیات ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں حسب تصریح سابقہ سفلی صفات مکسوبہ مدرکات کے پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اسلام انسان میں اور ذرات عالم میں وہ تعلق پیدا کرانا چاہتا ہے۔ جو اُن میں اور خود خدا تعالےٰ میں ہے۔ جب انسان صبغتہ اللہ کا جامہ پہن لیتا ہے تو انسانی استعداد کے مطابق اس کا بھی ذرات سے وہی تعلق ہو گا جو مالک کائنات کا عناصر سے ہے۔ ایک عمل الترب والا بالفرض اگر ہوا میں پرواز کرنا چاہے تو ادراک کرگس اپنے اندر پیدا کر کے اُن قوی کو تحرک میں لے آتا ہے جن کو جسم کرگس سے تعلق ہے۔ اس لئے اگر اوڑنے کا رنگ اس میں پیدا ہو جائے تو اس کی ذرات پر اُسی قسم کی حکومت ہے جیسی

کرگس کی اپنے جسم پر وہ گویا خود کرگس بن گیا۔ اور عجب نہیں
کہ وہ گدھ اور کرگس کی طرح مردار خوار بھی ہو جائے۔ یہ
ہیں نے مثال کے طور پر ذکر کیا ہے۔ اُڑنا نہ سہی انسان
بعض ایسی باتیں اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں جو حیوانی طاقتوں
سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر اسلام ان راہوں پر ایک سالک
کو چلائیگا جن سے کہ وہ ذرات اور ان کی وہ ترکیب جن سے
قوت پرواز پیدا ہو جاتی ہے انسان کی حکومت میں آجائے
اور وہ یہ ہی طریق ہے کہ اس کا خدا کی مخلوق سے وہی تعلق
ہو جو خدا کا ہے۔ اگر اسلام نے بعض قسم کی نفس کشیوں
پر زور دیا ہے تو اس لئے کہ جسمانیات پر حکومت کرنیکی
پہلی شرط یہ ہے کہ خود انسان حکومت جسم سے باہر ہو جائے
پھر اگر اسلام نے انفاق۔ اور خیرات پر زور دیا تو اس لئے
کہ کل مخلوقات کا تعلق اطاعت رب العالمین سے
ہے اُس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ذرہ ذرہ اُس سے
رزق پاتا ہے۔ طبعًا مرزوق رازق کی طرف جاتا ہے۔
پھر وہ انسان جس کے انفاس مخلوقات عالم کو فیض پہنچائیں
اور جس کا اپنا وجود مخلوق الٰہیہ کی ہر نوعیت کی خدمت میں

لگ جائے اس کے آگے کیوں مخلوق نہ جھک جائے
اب اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر ایک جنگلوں میں بیٹھنے والا
ممکن ہے کہ بعض ریاضات شاقہ کرکے اپنے نفس کو
حکومت جسم سے آزاد کرے۔ لیکن اس نے دنیا سے
کنارہ کش ہوکر دیگر مخلوق کی انسانی دائرہ میں نہ زیبت
کی نہ انہیں فیض پہنچایا تو پھر مخلوق کا اُس سے کیا تعلق
ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ نفس کشی کے ذریعہ
حکومت جسم سے آزاد ہوکر عالم جسم بن جائے اور کرگسی
ذرات کو اپنے اندر حرکت میں لاکر اڑنے لگے میں نے
یہ مثال اس لئے دی ہے کہ حسب روایات جب بعض
مسلم اولیائے کرام کے مقابل بعض جوگی قوت پرواز
دکھلانے لگے تو انہوں نے یہ ہی کہا کہ "ایں امر از غراب
وکرگس ہم مے آید۔ یہ قصہ صحیح ہو یا غلط اس سے ہمیں
تعلق نہیں اور نہ قوت پروازہی کا ثبوت ہمارے مقصد
کے لئے ضروری ہے۔ میں نے صرف ایک اصول کی تشریح
میں یہ ذکر کر دیا ہے ٭
جو تعلق ذرات عالم کو خدا تعالےٰ سے ہے۔ وہ ایک

محدود حد تک کیوں اور کس طرح انسان سے ہوجاتا
ہے۔ اُس کی کُنہ و حقیقت سے کوئی انسان آشنا نہیں
ہو سکتا۔ پھر چہ جائیکہ اس کی تشریح کی جائے۔ یہ راز
اگر کسی صاحب کشف پر کسی قدر کھلا بھی ہے تب بھی اُسے
عام فہم کرنا ایک مشکل امر ہے۔ البتہ قرآن کریم پر غور کرنے
سے سمجھ میں آتا ہے۔ اور جو کم و بیش متقدمین نے بھی لکھا ہے اسکی
حقیقت یہ ہے کہ کل ذرات کائنات اسمائے الٰہیہ کے آثار
و اظلال ہیں۔ جن قوانین کے ماتحت سالمات یا عناصر
اور ایسے ہی کل قوائے فطریہ کام کرتے ہیں۔ وہ سارے
کے سارے قوانین ان ہی فرمانروائے کائنات نے اسمأ
مبارکہ کے ماتحت بنائے ہیں۔ بعض صوفیائے کرام نے
یہانتک لکھا ہے۔ اور میری رائے میں بالکل صحیح بھی
ہے کہ دنیا کی ہر چیز خدا کی کسی ایک یا ایک سے زیادہ
صفات کا مظہر ہے۔ مثلاً یہی مٹی پانی اور آگ ان
تینوں میں سبحانیت کا ایک رنگ ہے۔ یہ تینوں چیزیں
اجسام سے ناپاکی کو دور کر دیتی ہیں۔ لیکن ان تینوں کا
طرز عمل تطہیر میں ایک دوسرے سے مختلف ہے مٹی میں

پاک کرنے کی طاقت پانی سے کم ہے لیکن آگ جس طریق سے اور جہانتک صفائی کر دیتی ہے وہاں پانی نہیں پہنچتا ٹھیک اسی طرح غلط کاروں سے غلطی کو دور کرنا بھی تین طریقوں سے ہوتا ہے۔ حلم۔ عفو اور غضب یعنی وقت کسی کی غلطی کے مقابل اگر چشم پوشی سے کام لیا جائے جو ایک حلیم مزاج کی شان ہے تو ایک انسان خود ہی نادم ہو کر غلطی کو چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن یہ طریق بہت ہی محدود دائرہ میں کام کرتا ہے۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ غلط کار کو اس کی غلطی کی اطلاع دیکر معاف کر دیا جائے۔ تیسرا طریق یہ ہے کہ غلط کار سزا پائے اور سزا کے ذریعہ اصلاح ہو۔ یہ تین طریق حلم۔ عفو اور غضب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مٹی جہاں ناپاکی کو چھپا کر صاف کر دیتی ہے۔ وہاں پانی اس ناپاکی کو ظاہر کرکے دھو ڈالتا اور پاک کر دیتا ہے۔ غضب کو جو تعلق آگ سے ہے وہ ظاہر ہے۔ اس طریق پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آگ پانی۔ مٹی جہاں قدوس وسبوح کے مظہر ہیں وہاں وہ خدائے تعالٰے کی صفات قہار۔ عفو اور حلیم کے بھی مظہر ہیں۔ کیا عجیب بات ہے کہ لوگوں کی

عیب پوشی کرنا بھی حلیم مزاجوں کا ہی کام ہوا کرتا ہے۔ اسکے
بالمقابل جہاں معافی کا ظہور ہوتا ہے۔ وہاں ستر عیب نہیں
ہوتا۔ اس لئے مٹی کا طریق تطہیر اگر ستاریت کا رنگ اپنے
اندر رکھتا ہے تو پانی عفو کی طرح ناپاکی کو ظاہر کر دیتا ہے
اسی طرح سے مزید غور پر بعض اور صفات الٰہیہ کا بھی تعلق
ان تین چیزوں سے نظر آجاتا ہے۔ میں نے چونکہ یہاں چند
باتیں بطریق اصول لکھنی ہیں۔ اس لئے میں اسی پر اکتفا کرتا
ہوں۔ اطباء نے یہ امر تسلیم کیا ہے۔ کہ بعض خوراکیں بعض اخلاق
پیدا کر کے بعض جذبات یا اخلاق پر اثر ڈالتی ہیں۔ جن خوراکو
میں ارضی اجزاء زیادہ ہوتے ہیں وہ طبیعت میں نرمی
خاکساری پیدا کرتے ہیں۔ آبی اجزاء کی چیزیں طبیعت میں
رحم۔ ملائمت۔ اور آتشی اجزاء کی چیزیں طبیعت میں غصہ پیدا
کرتی ہیں۔ حیوانات میں بھی ان جذبات کا ظہور خوراکوں سے
تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ جن جانوروں میں سبعیت ہوتی ہے
ان کی خوراک زیادہ تر گوشت ہے۔ چرندوں۔ پرندوں
میں بھی جن کی خوراک میں آتشی اجزاء کا حصہ زیادہ ہوتا ہے
اُن میں بھی غصہ اور حملہ کرنے کی عادت زیادہ ہوتی ہے۔

دوسرے جانوروں میں بھی جن کی خوراک کا زیادہ حصّہ ارضی مواد کا ہوتا ہے۔ مثلاً گھاس پات اُن میں قوت اندفاع اُن جانوروں سے کم ہوتی ہے جن کی خوراک میں آبی یا آتشی اجزاء زیادہ ہوں۔ کیا عجیب بات ہے کہ وہی پھل یا بقولات مزاج میں زیادہ حار ہوتے ہیں جن میں آتشی یا اجزائے آفتاب زیادہ ہوتے ہیں اور جن میں آبی اجزاء زیادہ ہوتی ہیں وہ مزاج میں بارد ہوتے ہیں حتیٰ کہ حار مزاج پھلوں کے درخت کی لکڑی میں بھی سوزش زیادہ ہوتی ہے۔ چیڑ کی لکڑی اپنے اندر اس قدر حرارت نہیں رکھتی جس قدر ببول کی لکڑی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ببول میں آتشی یعنی اجزائے آفتاب کثرت سے ہوتے ہیں اور چیڑ میں ہائڈروجن کے اجزاء زیادہ ہوتے ہیں۔ کیا عجیب نظارہ قدرت ہے کہ آگ اگر مظہر قہاریت سمجھ لی جائے۔ تو چونکہ اسی آگ کے زیادہ تر اجزاء ببول میں بشکل اجزائے آفتاب ہوتے ہیں تو وہ جانور جس کی غذا خاص کر خار مغیلاں بکثرت ہے یعنی شتر وہی کینہ و قہر میں ضرب المثل ہے +

اس صحیفہ قدرت کے نقشہ کو سامنے رکھکر یہ نتیجہ نکلتا

ہے کہ خدا کی جن صفات نے اپنے مناسب حال جو چیزیں پیدا کیں اُن ہی چیزوں نے انسان کے جسم میں جا کر اُن ہی صفات کا عکس پیدا کر دیا۔ مثلاً مثال بالا کو ہی لے لیا جائے خدا کا قہر۔ عفو۔ اور حلم نے آگ۔ پانی۔ اور مٹی کی شکل اختیار کی۔ پھر ان تین چیزوں نے مختلف شکلیں اور ہیولے بدل کر سبزیاں۔ بقولات اور گوشت پیدا کیا جن کو کھا کر انسان کے جذبات۔ حلم۔ عفو۔ اور قہر کی تولید ہوئی۔ لہذا اگر انسان خدا کی تصویر مانا جائے تو وہی صفات الٰہیہ جنہوں نے مختلف سفر کر کے پہلے آگ۔ پانی۔ اور مٹی کی شکل اختیار کی انہوں نے چند اور ہیولے بدل کر قلب انسانی میں آخر اپنی شکل اختیار کر لی۔ اب اگر خدا کی صفات قہر۔ عفو اور حلم اُن ذرات عالم پر جداگانہ حکومت کرتی ہیں۔ جن کی ترکیب نے آگ پانی مٹی پیدا کی ہوئی ہے تو پھر وہی ذرات اس انسان کی بھی حکومت تلے آجائینگے جس میں یہ تینوں خُلق بطور صبغتہ اللہ پیدا ہو گئے ہیں یعنی جس انسان میں یہ تینوں خُلق جذبات اور نفسانیت کی ملونی سے الگ ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں باتیں تو انسان میں ہوتی ہیں لیکن ان تینوں اخلاق

کو اُس وقت تک انسان صحیح طریق پر استعمال نہیں کر سکتا جبتک وہ گرفتار نفس ہوتا ہے۔ یا ہماری اصطلاح میں جبتک اُس پر جسم کی حکومت ہوتی ہے۔ وہی غضب جو ایک گرفتار ہوا و ہوس میں دوسروں کی بیجا ایذا رسانی کا سبب ہوتا ہے۔ وہی غضب ایک پاک نفس انسان میں غضب اللہ ہو جاتا ہے۔ جو صرف بغرض اصلاح اُسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب اصلاح کی طرز اور نہ رہے +

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کل کائنات اور اس کے اجزاء اسمائے الٰہیہ کا مظہر ہیں مختلف اسمائے الٰہیہ نے کائنات کی مختلف چیزوں کو شکل دی۔ وہ ساری کی ساری چیزیں زمین میں آ جمع ہوئیں۔ اس طرح زمین نے کل صفات خداوندی کے اظلال کو اپنے اندر لے لیا۔ زمین میں سے انسان نکلا جس میں تمام اجزائے کائنات نے جمع ہو کر وہ جذبات پیدا کئے جن میں صفات خداوندی مضمر ہیں اب اگر ذرات عالم پر خدا تعالیٰ کی حکومت کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ذرات اور اُن کے مختلف ہیولے خداوندی صفات کے آثار و اظلال ہیں تو پھر جس انسان میں وہی صفات

جذبات نفس سے الگ ہو کر ربانی شان اختیار کر لینگے علی قدر مراتب وہ بھی ذرات عالم پر حکومت کرنے کے قابل ہو جائیگا۔ اس لئے اسلام نے یہ امر پسند نہیں کیا کہ انسان جس مختصہ ترکیب ذرات کے خواص پیدا کرنا چاہیے وہ ترکیب مختصہ اپنے اندر پیدا کرے اور اس طرح اپنے اندر وہ خواص لے آئے جو اس ترکیب مختصہ سے تعلق رکھتے ہیں جیسے علم النرب کے عامل کرتے ہیں۔ بلکہ وہ ان صفات الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرے کہ جو ان ذرات یا تراکیب ذرات مختصہ کو بطور اپنے ظل کے پیدا کرکے ان پر حکمران ہو جاتی ہیں مثلاً اگر انسان چاہے کہ اس کی آنکھ میں سانپ کی آنکھ کی سی قوت مقناطیسی پیدا ہو جائے تو وہ ترکی مشقوں سے اپنے اندر ان ذرات کو حرکت میں نہ لائے جن سے سانپ پیدا ہوتا ہے کیونکہ جہاں اس میں سانپ کی مقناطیسی قوت پیدا ہوگی وہاں اس میں اسکا ناد یگر صفات مار بھی پیدا ہو سکتی ہیں بلکہ وہ ان صفات الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرے جن کے آثار ذرات مار اور ان کی ترکیب خاصہ ہے۔ پھر جس طرح مار یا قوائے مار خدا کی اطاعت کرتے ہیں اس کے جسم کے اندرونی اجزاء

بھی جو سانپ سے ملتے جلتے ہیں۔ اُس کے حکم کی اطاعت میں حسب ضرورت وہی کشش پیدا کرینگے۔ طریق اول میں وہ خود سانپ بنتا ہے۔ اور کیا عجب بات مسمریزم والوں نے لکھی ہے کہ جب انسان کی آنکھیں سانپ سے ملتی جلتی ہوں اُس میں وہ قوت پہلے ہی سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ طریق ثانی میں وہ حاکمانہ طور سے کام لیتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حاکم اگر کسی سے کوئی خدمت لے تو محکوم کی صفات حاکم میں ہونا ضرور نہیں۔ یہی فرق ان دو طریقوں میں ہے جسے سفلی اور علوی کہتے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ان قوتوں کو پیدا کرنا یا بالفاظ دیگر جذبات میں سے صفات الٰہیہ کو نکالنا یعنی صبغۃ اللہ میں رنگین ہو جانا صرف کامل توحید پر قائم ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کے اخلاق خدا کے اخلاق ہو جائیں۔ وہ کل نفسانی جذبات سے پاک ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو اور قلب سلیم کے ذریعہ اُس جنت میں داخل ہو کہ جہاں اس کے قوائے مضمرہ کامل طور پر بارور ہو جائیں +

یہ امر ہرگز نہ بھولنا چاہئیے کہ یہ دنیا ایک تیاری کی

جگہ ہے۔ ہم اس دنیا میں ذرات عالم پر حکومت کرنے نہیں آئے۔ جس قدر تکمیل نفس کے لئے ہمیں اس حکومت کی ضرورت ہو وہ حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں ہم اپنی قوتوں کو تیار کر رہے ہیں جن کا کامل ظہور آنیوالی زندگی میں ہوگا۔ یعنی تکمیل نفس سے مراد حکومت نفس انسانی بر کائنات نہیں۔ بلکہ ان صفات الٰہیہ کو باہر لانا ہے جو نفس انسانی کے حجابوں میں مستور ہیں۔ بات یہ ہے کہ جن صفات الٰہیہ کے اظلال نے جن اشیاء و قوائے عالم کی شکل اختیار کی وہ ساری کی ساری کرہ ارضی میں سے ہو کر اُس کرہ لحمی میں جمع ہو گئیں جس کا نام قلب انسان ہے۔ کرۂ ارضی میں صفات الٰہیہ کی تجلیات اشیاء ارضی اور اُن کے خواص کے لباس میں تھیں۔ مگر کرہ لحمی میں انہوں نے جذبات انسانی کی ابتدائی شکل اختیار کی۔ ان جذبات کو پہلے معمولی اخلاق کی شکل میں لے آنا۔ پھر ان میں سے اخلاق ستودہ پیدا کر کے اُن کو روحانیات میں متبدل کر دینا تکمیل نفس ہے۔ یہ روحانیات دراصل ہمارے اخلاق کا وہ رنگ ہے۔ جسے ہم صبغۃ اللہ

کہتے ہیں مطلب ہمارا یہ ہے کہ روحانیات سے کوئی معجز نما طاقت یا خوارق کی استعداد پیدا کر لینا مراد نہیں جیسا کہ اکثر لوگوں نے دھوکہ کھایا ہے۔ بلکہ روحانیات انسانی جذبات یا اخلاق کی ان صورتوں کا نام ہے جنہیں ہم اخلاق الٰہیہ کہتے ہیں۔ ہم نے مدرکہ حیوانی کو جو ہمیں جسم سے بطور ورثہ ملا ہے مدرکہ ربانی میں متشکل کرنا ہے۔ اب اگر ادراک ربانی ہی کائنات پر حکومت کرتا ہے تو اس حکومت میں ہمارا حصہ بھی ایک امر یقینی ہے۔ الغرض جو قلب ابتدا میں قلب حیوانی تھا یعنی جس میں مختلف حیوانات کے جذبات موجزن تھے وہ حالت تکمیل میں قلب سلیم کا نام پاتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر جسے پیدائش پر نفس امارہ کہتے تھے وہ تکمیل پر نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ اس حالت کے ساتھ انسان نے دنیا کو چھوڑنا ہے۔ گویا انسان نے اس دنیا میں آکر اس استعداد کو حاصل کرنا ہے جس نے اس کی موت کے بعد عالم عقبےٰ میں اسے ترقیات جنت کے دروازہ پر لا کھڑا کرنا ہے۔ چنانچہ تعلیم قرآنی نے جنت کا پاسپورٹ نفس مطمئنہ یا قلب سلیم ہی ٹھہرایا ہے۔ یہ دونو دراصل ایک ہی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں۔ یا بحث بالا

کے رو سے یوں کہو کہ وہی صفات الہیہ جن کے اظلال سب سے اوّل ذرات یا سالمات کی شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر وہ مختلف ہیولوں میں ہوتے ہوئے نفس امارہ کی تہوں میں قلب انسانی کو اپنا مسکن بنا لیتے ہیں۔ وہی جب تہذیب و ترتیب شرعی کے تلے اصلی شکل میں آجاتے ہیں تو اُن کا نام قلب سلیم یا نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ جن سے انسان وارث فردوس بریں ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا ہے یاایھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ الامن اتی اللہ بقلب سلیم۔

مجھے لبسا اوقات یہ خیال آیا کہ جس کتاب نے انسان کے سامنے نجات اور جنت کی یہ حقیقت پیش کی ہو اور ایسا ہی جس کتاب نے مذہب کی غرض و غائت یہ بیان کی ہو کہ مذہب انسان کی تکمیل نفس کے لئے ہے یعنی وہ ذرات عالم جو حالت غیر مدرکیت میں فطری ہدایت کے ماتحت مقام سالمات سے چل کر قلب انسان تک آپہنچے ہیں اور یہاں سے انہوں نے اُس اصلی مقام اور شکل پر پہنچ جانا ہے

جہاں سے وہ ابتداً چلے تھے۔ لیکن اس منزل پر آ کر وہ چونکہ ادراک حاصل کر چکے ہیں اس لئے آگے چلنے کیلئے ادراکی رنگ میں ہدایت چاہتے ہیں۔ اور یہ ہدایت الہام کی شکل میں انہیں ملتی ہے۔ اسی لئے خدا کی طرف سے دنیا میں مذہب آتا ہے۔ جب ایک مسلم کا یہ نصب العین ہو اور اس کے ذہن میں الہام یا مذہب کی یہ غرض ہو تو وہ کس طرح عیسائی مذہب کو بالخصوص اور دیگر مذاہب کو بالعموم اختیار کر سکتا ہے دوسری طرف میں اس بات کو بھی دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ کیوں بعض خوارق لوگوں کی نگاہ میں مذہبًا وجہ امتیاز بن جاتے ہیں۔ جو بوالعجبیاں یا کرشمے یورپ میں آج عمل الترب یا فن توجہ کے مشاق دکھلا رہے ہیں اور اُن سے ملتی جلتی باتیں ہندوستان میں بھی ہندو مسلمان دکھلایا کرتے ہیں۔ وہ کیوں جبہ و دستار یا سنیاس و بھبوت کے ذریعہ کمالات مذہب میں داخل کئے جاتے ہیں۔ یہ تو معمولی باتیں ہیں۔ محنت و کسب انسانی ہے۔ کوئی ڈاکٹر و طبیب بن گیا۔ کسی نے قوت ارادی بڑھا کر بلا استعمال ادویات سلب امراض کی دوکان کھول لی۔ اس بات میں جو مغرب اور

مشرق میں فرق ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ لندن میں ایک طرف کسی سرجن اور طبیب کا مکان ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل جو سائن بورڈ ہوتا ہے وہ بتلاتا ہے کہ اس مکان میں مرضوں کا علاج توجہ سے ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں آخر الذکر طبیب اس طرح اپنے آپ کو پیش نہیں کرتے۔ یہاں یہ مذہب کی پیشوائی کا جامہ پہنتے ہیں اور سلب امراض اپنی دعاء۔ توجہ یا کمال نفس کا نتیجہ ظاہر کرتے ہیں۔ لندن میں فیس مقرر ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں اس کا نام نذر نیاز و کھشنا یا بھینٹ ہوتا ہے۔ بات ایک ہی ہے شکلیں دو ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ بزرگان دین کی ایک یہ شان بھی ہوتی ہے۔ صرف میرا مقصد اس قدر ہے کہ ان امور کو علی وجہ التجرد دینی امتیاز نہ بنایا جائے کیونکہ ایک طرف مسلمان اصلی راہ سے دور جا رہے ہیں۔ دوسری طرف چونکہ اس قسم کے اکتسابات آج ہندو مسلمان عیسائی حتیٰ کہ لامذہب اور دہریہ بھی دکھلاتے ہیں۔ اس لئے انہیں نشان کاملیت بتلانا گویا اپنے مذہب کو آپ جھٹلانا ہے تم اسے ایسا ہی سمجھو اور قرار دو اور یہ واقعی ایسا ہی ہے

جیسے اور انسانی ہنر۔ کسے باشد۔ وہ اسے حاصل کر سکتا ہے پھر تم اسلام میں دوسروں کو وہ باتیں دکھلا سکتے ہو جنہیں اُن کے مذہب پیش کرنے سے عاجز ہیں یہی ایک راہ ہے جس سے اسلام کا بول بالا ہوگا جس بات میں اسلام کو کل مذاہب پر فوقیت ہے وہ اس کی تعلیم توحید ہے۔ اور ہم نے اپنی کتاب توحید میں ثابت کر دیا ہے کہ کس طرح ہر کمال انسانی کا حصول توحید پر عملاً ایمان لانے سے وابستہ ہے۔ معاشرت۔ اقتصاد۔ تمدن۔ سیاسیات۔ اخلاق۔ روحانیات۔ الغرض انسانی اکتساب کا کوئی پہلو ایسا نہیں جہاں لا الہ الا اللہ پر ایمان لانا انسان کے سر پر تاج فضیلت نہ رکھدے +

مقالہ دوم

نشاءِ عالم

اسلامی نکتہ خیال سے روحانیت کی حقیقت ایک انسان اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب وہ ان اجزاء سے بھی واقف ہو جن سے قالب انسان تیار رہوا۔ از روئے تعلیم اسلام۔ جیسے تفصیل کے ساتھ ہم نے کہیں اور ذکر کیا ہے۔ انسانی قالب میں کائنات کے ہر ایک ذرہ نے اپنے تمام وکمال خواص کے ساتھ جگہ پائی ہوئی ہے۔ یعنی جو کچھ بھی کائنات میں ہے وہ انسان کے جسم میں جمع ہو چکا ہے قرآن کی روشنی میں جس حقیقت تک علماء کرام پہنچے ہیں وہ یہی ہے کہ خدا تعالےٰ نے کل کی کل اشیاء کائنات کے پیدائش سے پہلے ان قواء یا ارواح اشیاء کو پیدا کیا جو مختلف حجابوں اور علاقوں کو اختیار کر کے موجودہ اشیاء کائنات کی شکل میں متشکل ہو گئیں اور جن کیفیات کا نام ان اشیاء کے خواص ہیں وہ دراصل وہی جوہر یا قواء ہیں جو ان سے پہلے پیدا ہوئے۔

لہذا اسلامی مسئلہ روحانیت کے کما حقہ سمجھنے سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا چاہئیے کہ از روئے تعلیم اسلام یہ کائنات کس طرح پیدا ہوئی اور نشاءِ عالم کا کیسے ظہور ہوا۔

قدیم حکماء جہاں زمین و مافیہا کی پیدائش کو آب۔ آتش خاک۔ باد۔ چار عناصر سے وابستہ کرتے تھے۔ نئی تحقیق نے ان چار عناصر کو تو مرکب قرار دیا۔ اور ان کے قائم مقام۔ اسّی اور نوّے کے درمیان عناصر تجویز کئے۔ اور ان اسّی نوّے عناصر کو سرچشمہ سالمات قرار دیا ہے۔ اس سے بھی تحقیق آگے گئی تو یہ بتلایا گیا کہ جس چیز سے یہ سالمات پیدا ہوئی ہیں وہ ذرات برقی ہیں۔ جن کا نام الیکٹرون ہے جنہیں ایتھر سے نکلے ہوئے مثبت و منفی ذرات شعاعی مختلف مقداروں میں ملکر پیدا کر دیتے ہیں۔ ان سالمات کی تراکیب مختلف سے یہ معلوم شدہ عناصر پیدا ہوتے ہیں۔ جن میں کچھ ہوائیں ہیں کچھ دھاتیں۔ کچھ نمک۔ کچھ مختلف تیزابوں کی ابتدائی شکلیں ہیں لیکن یہ سارے کے سارے دراصل ذرات برقی ہی ہیں چنانچہ۔ چاندی۔ سونا۔ تانبہ۔ قلعی۔ گو مختلف دھاتیں اور عنصر ہیں۔ لیکن یہ ایک ہی چیز ہے یعنی ذرات برقی جن کی

ایک ترکیب نے تانبہ پیدا کیا اور دوسری نے سونا۔ اسی بنا، پر اب پھر جس کیمیاگری کو وہم سمجھا جاتا تھا اُسے ایک حقیقت سمجھنے کی طرف مغربی حکماء کا میلان ہو رہا ہے۔ اگر کسی تجویز سے تانبے کے ذرات برقی اپنی ترکیب کو چھوڑ کر الیکٹرون کی اُس مقدار اور ترکیب کو حاصل کر لیں جو سونے میں موجود ہیں تو تانبہ سونا بن جائیگا۔ مہوسین خواہ کسی خیال سے گندھک پارہ یا مختلف جڑی بوٹی کو ترکیب دیں۔ پھر ان سے اکسیر کی چٹکی پیدا کر کے کسی ادنےٰ دھات پر ڈال کر سونا بنائیں وہ بھی دراصل یہی کام کرتے ہیں۔ تانبے کو پگھلا کر اس پر جو چیزیں اور ڈالی جاتی ہیں۔ اگر ان میں سے ذرّات برقی کافی مقدار میں نکل کر بمقدار مطلوبہ تانبے کے ذرّات میں مل جائیں تو سونا بن جائیگا۔ یہ جدید اہل تحقیق کی رائے ہے۔ میرے خیال میں اگر مہوسین کسی خاص قسم کی برقی رو سے بھی کام لیا کریں یعنی مختلف چیزوں کی آمیزش کے لئے آگ کی بجائے برقی رو استعمال کریں تو شاید اُن کے کام میں زیادہ سہولت ہو جائے اور غالبًا پھر کسی آنچ کی کسر باقی نہ رہے۔ ہماری بحث سے اس مضمون کو اسی قدر تعلق ہے کہ کل عناصر اور اُن کی ترکیب

نے آیندہ جو نجمی۔ شجری۔ حجری۔ حیوانی۔ ہوائی شکل اختیار کی ان سب کی جڑ ذرات برقی ہے۔ اسی طرح زمین سے باہر جو کچھ کائنات میں ہے وہ سب کا سب ذرات برقی کی ہی مختلف ترکیبیں ہیں۔ اور ذرات برقی جس موہوم چیز سے نکلتے ہیں نیبولا کہلاتا ہے جس کا مبدا ایتھر مانا گیا ہے۔ اس نیبولا کی اصلیت کچھ بھی ہو یہ ایسی موہوم جسامت کے ذرات کا مجموعہ ہے جو لاکھ دو لاکھ تعداد میں مل کر ایک برقی ذرہ پیدا کرتے ہیں۔ اس کی اگر کوئی خاصیت نظر آتی ہے تو وہ ایک قسم کی چمک یا روشنی ہے۔ جسے عربی زبان میں نور کہتے ہیں۔ لہذا یہ نیبولا نوری ذرات اپنے اندر رکھتا ہے۔ جو الیکٹرون پیدا کرتے ہیں جن سے نشاء عالم ہوا۔ قد صدق اللہ وتعالی اللہ نور السموات والارض ٭

تحقیق سائنس نے آخر کار قرآن کی صداقت پر مہر کی۔ از روئے قرآنی تعلیم خدا تعالے کی صفت نور نے بطور اپنے ظل کے اس نور کو پیدا کیا جس سے بتدریج کل کائنات بنی اس کا نام نیبولا رکھا جائے۔ یا اس کی کسی ارتقائی منزل کا نام الیکٹرون یعنی ذرات برقی رکھا جائے۔ اس سے

کچھ فرق نہیں آتا۔

اس موقعہ پر میں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا مذہب ہمہ اوست نہیں۔ اسی لئے میں نے لکھا ہے کہ کائنات کا ابتدائی سے ابتدائی مادہ یعنے ہیولا نور نہیں بلکہ صفت نور کا ظل ہے۔ ہاں ہمہ اوست کی جگہ ہمہ از وست کہدینا ایک حقیقت ہے ہیولا شروع سے ہی قانون کی حکومت تلے نظر آتا ہے جس سے صاف واضح ہے کہ ہیولا اور قانون دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ کیونکہ ان میں حاکم و محکوم کا تعلق ہے۔ مثال کے طور پر ہم پانی کی حیثیت پہ غور کرتے ہیں۔ پانی ہائڈروجن اور آکسیجن سے پیدا ہوا ہے۔ دونوں بذات خود جن برقی ذرات کی مختلف تراکیب سے پیدا ہوئے ان میں تنویری ذرات موجود ہیں جو صفت نور کا ظل ہیں۔ اب اگر پانی کو ظل نور کا ہیولا نہ کہا جائے بلکہ خود نور یعنی خدا کی ایک شکل کہا جائے تو پھر کیوں پانی ایک بے حقیقت چیز کی طرح زنجیر قانون میں جکڑا جاتا ہے۔ بلکہ جو انسان پانی پہ حکمرانی کے قوانین سے واقف ہو جائے وہ اُسے اپنی غلامی میں لے آتا ہے۔ پھر جس طرح چاہے

اس سے خدمت لیتا ہے۔ کیا عجیب بات ہے کہ ایک مسلمان "ہمہ اوست" کا بھی قائل ہو اور سخر لکم مافی السموات والارض پر بھی ایمان رکھے جسے خدا یا خدا کی ذات سے سمجھے اُسے عملاً اپنا غلام بھی سمجھے۔ نعوذ باللہ انسان تو کُل کائنات کا حکمران ہے۔ اور اپنی اس حکومت میں بعض محکوم چیزوں کو ذلیل سے ذلیل جگہ دیتا ہے۔ اب اگر کل چیزیں خدا ہی ہیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں خدا کی ایک شکل یعنے انسان اس کی دوسری شکل کو ذلیل کر رہی ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ خدا کے ایک ظل اور دوسرے ظل میں حاکم محکوم دشمن دوست کا رشتہ ہو۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ خود ہی حاکم خود ہی محکوم ہو اور آپ ہی اپنا دشمن ہو۔ علاوہ ازیں خدا نے اپنی صفات کے اظلال میں جو اشیاء مختلفہ پیدا کی ہیں ان پر انسان حکومت نہیں کرتا بلکہ اُن پر تو قوانین الٰہیہ کی حکومت ہے جن کو دریافت کر کے انسان آلہ حکمرانی ہو جاتا ہے یہ قوانین الٰہیہ دراصل خدا تعالےٰ کی صفات مختلفہ ہیں۔ مثلاً اگر وہ رب ہے تو جن راہوں سے دنیا کی ربوبیت ہو رہی ہے وہی قوانین الٰہیہ ہیں۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ

کے صفات نے بطور اظلال کل چیزیں پیدا کی ہیں۔ لیکن جس چیز سے وہ ان پر حکومت کرتا ہے وہ خدا کی صفات ہیں۔ اس لئے جس قدر قوانین انسان پر منکشف ہو جاتے ہیں وہ اُن کے صحیح استعمال کے وقت خدا کی صفات کا مظہر ہوتا ہے۔

خود سائنس کے انکشافات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اشیائے کائنات تو صفات الٰہیہ کے اظلال ہیں لیکن ان پر صفات الٰہیہ کی حکومت ہو رہی ہے۔ کاش مغرب کے بائلوجسٹ دہریہ نہ ہوتے ان کے سامنے خدائے قرآن ہوتا یعنی وہ صفات الٰہیہ مندرجہ قرآن پر تفکر کر کے سُنن الٰہیہ باصطلاح سائنس قوانین فطریہ کو دریافت کرتے تو بہت تھوڑے عرصہ میں علمی انکشافات کہیں کے کہیں پہنچ جاتے۔ ابتداءً اگر مسلمانوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں بے نظیر ترقیات علمی کر لی تھیں تو اس کی وجہ بھی یہی تھی۔ کس قدر مصیبت کا سامنا اس وقت اعلیٰ درجہ کے بائلاجسٹوں کو ہے کہ ایک طرف تو وہ کسی بالاتر ہستی کو ماننا نہیں چاہتے۔ اور دوسری طرف آئے دن کے

انکشافات انہیں حیران کر کے اُن سے بلاناغہ ماسبق نتائج
کی تردید کراتے جاتے ہیں۔ اور مجبوراً وہ انہیں صفات سے
مادہ کو متصف کرتے جاتے ہیں جو ہم خدا کی طرف منسوب
کرتے ہیں مثلاً اب وہ اس بات کے ماننے پر مجبور ہو گئے
ہیں کہ ذرات پر قانون کی بہت ہی سخت حکومت ہے۔ پیدائش
کائنات فطرت کی کسی بے اصول یا بے تدبیر حرکت کا نتیجہ
نہیں جیسے کہ آج سے کچھ سال پہلے سمجھا گیا تھا۔ بلکہ اب وہ
یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ مقرر کردہ راہوں پر
ایک مشین کی طرح چلنے پر مجبور ہے۔ اور ان راہوں پر اس
انقیاد سے قدم زن ہے کہ شہد کی مکھی کی طرح وہ اُن راہوں
سے اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ ذرات میں اُن ہیولوں کے بننے
کی استعداد پہلے سے موجود ہے جن میں اُنہیں متشکل ہونا
ہے وہ ان منازل کو جانتے ہیں جنہیں انہیں گذرنا ہے۔ وہ اس
مواد سے واقف ہیں جو انہیں منزل مقصود تک پہنچنے میں استعمال
کرنا ہے۔ الغرض وہ سب کچھ جانتے ہیں جس کی طرف آیتہ
وللہ اسلم من فی السموات والارض طوعاً وکرھاً اور
ربنا الذی اعطی کل شیئٍ خلقہٗ ثم ھدیٰ۔ اشارہ کرتی ہے

یعنی ذرات عالم طوعاً وکرہاً قوانین پر چلتے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ جو کچھ بھی کائنات میں ہے وہ دراصل ایک چیز ہے۔ لیکن جو بات وہ نہیں مانتے وہ یہی ہے۔ کہ وہ چیز اور قانون دو الگ چیزیں ہیں۔ وہ قانون کی حکومت تو اُس چیز پر مانتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اسے قانون سے جدا مانیں تو لازماً انہیں مقنن ماننا پڑتا ہے جس سے ہستی باریتعالیٰ ثابت ہوجاتی ہے۔ اس لئے وہ مجبور ہو کر ابتدائی چیز کا نام اب بیجان یا بے قانون مادہ نہیں رکھتے جس نے یہ کل کے کل ارتقائی منازل محض اتفاق سے طے کرلیں ایسا ہی وہ ترقی مادہ کو اب کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں قرار دیتے بلکہ وہ اُسے مادہ کے قانون پر چلنے کا نتیجہ سمجھتے ہیں چنانچہ مغرب کے زبردست جرمن بائلوجسٹ ہیکل نام نے مادہ کی ابتدائی شکل کا نام لاسبسٹینس (LAW SUBSTANCE) رکھا ہے۔ یعنی وہ چیز جس کی ذات میں قانون ہے اس سے مراد یہ ہے کہ مبدءِ عالم جو چیز ہے وہ اپنے اندر قانون رکھتی ہے ایک طرف تو واضع قانون ہے اور دوسری طرف قانون پر چلنا اُس کی فطرت ہے۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ اس فضائے

عالم میں جو چیز ہے اس میں چار باتیں کام کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ چیزوں کو خلق کرتی ہے یعنی اُن کے لئے مختلف ہیولے اور شکلیں تجویز کرتی ہے۔ اور ذرّات تنویری میں سے مناسب مقدار تجویز کر کے اُن کو آپس میں ملاتی ہے۔ یعنی وہ خلق کا کا فعل کرتی ہے کیونکہ عربی لفظ خلق کے معنی شکل تجویز کرنا۔ جس مادہ میں سے کوئی شکل پیدا ہو اس کی مقدار تجویز کرنا اور مختلف مقداروں کو پھر ملا دینا یہ سب لفظ خلق کے معنے ہیں۔ پھر وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جب کوئی چیز خلق ہو جاتی ہے تو پھر وہ اپنے بقا کے لئے خوراک بھی تلاش کرتی ہے یعنی خلق کے علاوہ رزاقیت کا رنگ بھی اس میں موجود ہے۔ پھر وہ ایک مقرر میعاد تک اُس شکل میں قایم رہنے کی استعداد بھی رکھتی ہے یعنی اس کی ذات کے اندر قوانین قیومیت اور اور اُن پر چلنا بھی ہے۔ یہ قیام حیثیت پر پیدا شدہ شکل اُس دن تک رکھتی ہے۔ کہ جب اس میں کی بالقوہ خاصیتیں بالفعل ہو جائیں۔ یعنی اُس کے اندر قانون خالقیت اور اُن پر چلنے کی استعداد بھی ہے۔ الغرض مادے کی ابتدائی سے ابتدائی شکل یعنی نیبولا تک کو ہی دیکھ لیا جاوے۔ وہاں بھی اس کے

اندر یہ چاروں کے چاروں قانون کام کرتے نظر آتے ہیں۔ یعنی خالقیت۔ رزاقیت۔ قیومیت۔ اور فالقیت عربی لفظ ربوبیت کے مفہوم میں یہ چاروں باتیں پائی جاتی ہیں۔ گویا اہل سائنس اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ کائنات کی منتہیٰ تک بھی پہنچ جاؤ۔ وہاں بھی قوانین ربوبیت کام کر رہے ہیں۔ اور باقی جس قدر بھی دریافت شدہ قوانین ہیں وہ ان چاروں کے معین یا مکملات و متممات ہیں۔ الغرض کل کی کل کائنات اپنی ابتدائی اور انتہائی شکل میں۔ یعنی اپنے دونوں منتہاؤں میں ربوبیت کے ماتحت کام کر رہی ہے۔ اس طرح یہ لوگ قرآن کی اس آیت وان الی ربك المنتهیٰ (تمہارا رب تمہارا منتہیٰ ہے) کے آگے سجدہ تو کرتے ہیں۔ لیکن جس بات کے ماننے کو ان کا جی نہیں چاہتا وہ یہ ہے کہ رب اور مربوب دو الگ چیزیں ہیں۔

حکیم ہیگل اور مسلم متکلم میں دراصل وہی فرق ہے جو "ہمہ اوستی" اور "ہمہ از وستی" میں ہے۔ ہیگل جسے مبدء عالم کہتا ہے وہ ایک چیز ہے جس کے اندر مواد اور قانون دونوں موجود ہیں۔ قائل ہمہ اوست کا مذہب یہ ہے کہ مواد اور قانون

دونوں مبدءِ عالم یعنے خدا کے اجزا ہیں۔ لیکن قرآن کا مذہب یہ ہے کہ مبدءِ عالم ایک ذات پاک ہے جس کی مختلف صفات ہیں۔ اس کی صفت نور کے ظل نے مواد عالم کا رنگ اختیار کیا اور اس کی دوسری صفات کے مقتضیات قوانین مختلفہ کی شکل میں مواد عالم پر کام کرنے لگے اور اس طرح کائنات پیدا ہو گئی۔ ہیکل کو جو بات دھوکہ دے رہی ہے۔ یہ ہے کہ وہ اشیائے عالم کی ہر ایک چیز میں قانون پر چلنے کی استعداد دیکھتا ہے۔ ہر ایک چیز اپنے خواص ظاہر کرنے میں۔ طبعًا ایک قانون کے ماتحت چلتی ہے اور ایک لمحہ بھر کے لئے بھی قانون مقررہ سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتی اور یہ بھی سچ ہے کہ قانون پر چلنا اس کی فطرت میں ہے۔ اس نئے جہاں اُس کو غلطی لگی ہے وہ قانون اور استعداد اتباع قانون میں فرق نہ کرنا ہے جس بات نے مصیبت ڈالی ہے وہ یہ ہے کہ جس قانون کی کسی چیز کو پیروی کرنا ہے اس کا وجود اس چیز سے خالی نظر نہیں آتا۔ ایک غیر ذی عقل چیز کا ہمیشہ مقررہ قانون کی اطاعت کرنا جہاں اسکی پیروی قانون کی استعداد کو ظاہر کرتا ہے۔ وہاں یہ بھی دکھلاتا ہے کہ قانون اُس کے

اندر ہی ہے۔ یعنی چیز کے خواص کو ظہور میں لانے کی راہیں اور ان راہوں پر چلنے کی استعداد سب اُس چیز کے اندر ہیں یہ امور ہیکل کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ دہر کا نام بحیثیت مجموعی لاسبسٹینس رکھے۔ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ انسان تو خلاصہ کائنات اور مادہ کی بہترین شکل ہے۔ جتنی کہ وہ قانون کو سمجھنے اور بنانے کی بھی طاقت رکھتا ہے۔ اس میں قانون پر چلنے کی تو استعداد ہے۔ لیکن وہ ہر معاملہ میں جہاں اُس کی ترقی اور نشوونما وابستہ ہے خارجی ہدایت قانون چاہتا ہے۔ چاہیئے تھا کہ جن قوانین پر چل کر اس کو اپنے ودیعت شدہ قوائے کو بالفعل کرنا ہے۔ اُن میں وہ کسی ہدایت خارجی کا محتاج نہ ہوتا

اس میں شک نہیں کہ جو چیز دوسری چیز کی مولد ہوتی ہے وہ نہ صرف آخرالذکر کا مواد ہی مہیا کرتی ہے بلکہ اُن راہوں پر چلنے کی استعداد بھی رکھتی ہے۔ جن پر چل کر آخرالذکر کو پیدا ہونا ہے۔ اور ساتھ ہی اُن راہوں کا علم بھی اُس میں ہوتا ہے گویا ہر ایک چیز میں مادہ۔ استعداد پیروی قانون۔ اور علم قانون تینوں موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے ہیکل یا اس کے ہمخیال اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قانون کوئی خارجی چیز نہیں بلکہ اشیاء کا اپنا

خاصہ ہے۔ ان حالات میں امر تنقیح طلب یہ قرار دینا ہوگا کہ قانون اشیاء کا ذاتی جوہر ہے۔ یا اس کا علم اور اس کی ہدایت انہیں باہر سے ملتی ہے۔ چونکہ مادہ کے غیر ذی عقل ہیولوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ہم کوئی قطعی فیصلہ کر سکیں اور بالمقابل یہ دونوں باتیں بھی ممکن ہیں یعنی مادہ کے اندر ہی قانون ہے۔ یا مادہ کو کسی خارجی وجود نے قانون پر چلا دیا۔ اس لئے اس مسئلہ کے حل کرنے کے لئے ہم موجودات میں سے صرف اُسی وجود کو لے سکتے ہیں جس میں ادراک تعقل تکلم موجود ہو۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پانی میں بذاتہٖ نیچے کی طرف جانے کی خاصیت ہے۔ اور اس کو اُن راہوں کا علم ہے کہ جن پر چل کر اُسے مختلف شکلیں اختیار کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پانی میں مختلف راہوں پر چلنے کی استعداد تو ہے۔ لیکن ان راہوں پر چلنے کا علم اور ہدایت اس کو کسی نے باہر سے دیا ہے۔ ان دو امور میں فیصلہ کون کرے کیونکہ پانی میں نہ تعقل ہے نہ تکلم اس لئے اس امر کے فیصلہ کے لئے انسان ہی بہترین مثال ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مادہ کے جس قدر جوہر اور خاصیتیں ہیں وہ انسان میں پورے طور

پر آچکی ہیں۔ اس لئے اگر ہر فرد کائنات میں یہ تینوں چیزیں یعنی استعداد اتباع قانون۔ و علم قانون بذاتہ موجود ہیں تو یہ تینوں باتیں علی وجہ الکمال انسان میں ہونی چاہئیں۔ ہم اسی کتاب میں دکھلا چکے ہیں کہ انسانی جسم میں ہر ایک چیز بننے کا مواد موجود ہے۔ اور ایسا بننے کے لئے جن قوانین پر چلنا ضروری ہے۔ انپر چلنے کی استعداد بھی انسان میں موجود ہے۔ لیکن ان قوانین کا اسے مسلمہ علم نہیں اُسے ہر قدم پر خارجی ہدایت کی ضرورت ہے۔ اس لئے یہ امر طے ہو گیا کہ مادہ میں قانون پہ چلنے کی تو استعداد ہے لیکن قانون کی ہدایت اُسے باہر سے ملتی ہے۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جو موسےٰ نے فرعون پہ ظاہر کی اُس نے موسیٰؑ سے پوچھا کہ تیرا رب کون ہے؟ جناب موسےٰ نے فرمایا۔ ربنا الذی اعطی کل شیئ خلقہ ثم ھدیٰ۔ میرا رب وہ ہے جس نے کائنات میں ہر ایک چیز کی الگ الگ شکل اور اُس شکل کے بننے کے لئے ترتیب و مقدار مواد کی راہیں تجویز کیں اور اُس کے بعد اس چیز کو اُن راہوں پہ چلنے کی ہدایت دی +

لہذا اشیائے کائنات کے اندر قانون نہیں۔ قانون اُنکی

ذات سے الگ ہے یعنی قانون اور مواد دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دونوں میں تقدیم و تاخیر ہے۔ جب یہ بات مسلم ہو جائے کہ قانون اور مادہ دو الگ چیزیں ہیں۔ اور ان میں حاکم محکوم کا تعلق ہے۔ تو قانون کی حکومت اور مادہ کی محکومیت فیصلہ کرتی ہے کہ مادہ کی پیدائش سے پہلے قانون موجود ہے۔ ہربرٹ سپینسر نے بھی معناً اس امر کو تسلیم کیا ہے۔ وجود قانون اُس ادراک کو چاہتا ہے کہ جس کے ارادہ نے قانون و مادہ بنایا یا انشاء عالم کیا اسی حقیقت کی طرف کن فیکون اشارہ کر رہا ہے۔ جس سے ہستی باری تعالیٰ کا ایک زبردست ثبوت ملتا ہے +

یورپ کے محققین اگر پیدائشاً مسلمان ہوتے تو یہ دقتیں کبھی نہ ہوتیں۔ ایک ہیکل جیسا انسان جو تحقیق کرتا کرتا اس نتیجہ پر آ جائے کہ جس چیز سے کل دنیا پیدا ہوئی اور چل رہی ہے اُس کے لئے قانون بمنزلہ روح اور جان کے ہے۔ اور اس طرح اس سارے فلسفہ کو ملیا میٹ کر دے جس کے ماتحت یہ مانا جاتا تھا کہ مادہ کسی قانون کے ماتحت کام نہیں کرتا۔ بلکہ مادہ جو اندھا دھند صورتیں اختیار کر لیتا ہے وہی

قانون ہے۔ اور پھر وہ وجود مقنن کی تقدیم سے انکار کرے
اس کی اور کوئی وجہ نہیں کہ عیسائی تھیالوجی میں جو بھونڈا، ناکمل
اور رذیل شان الوہیت خدا کا نقشہ انہیں نظر آیا۔ اس سے
وہ ابتداء کچھ ایسے بیزار ہو گئے کہ پھر اصلاح نہ ہو سکی حکیم بل
نے جو مشہور دہریہ ہے بالکل سچ کہا ہے کہ اس خدا کے
اخلاق سے تو مسیح کے اخلاق اچھے ہیں۔ یعنی خدا تو انسان
کے گناہ بلا عوض لئے نہ بخشے لیکن مسیح اپنی جان دیکر بخشوا
دے۔ کاش ہیکل۔ مل۔ اسپنسر۔ ہکسلی جیسے انسان کسی
مسلمان کے گھر میں ہوتے۔ وہ خدا کا نقشہ قرآن میں دیکھتے
تو انہیں نظر آجاتا کہ خدا کی کتاب مبین (نیچر) اور خدا کے
قرآن مبین ایک چیز ہے۔ یعنی قرآن مجید ذات باری کا نقشہ
کھینچتا ہے اس کی صداقت پر کائنات کا ذرہ ذرہ شہادت
دیتا ہے جس بات کو انہوں نے سالہا سال کی درازی تحقیق
سے دریافت کیا وہ انہیں قرآن مجید ایک لحظہ بھر میں بتلا
دیتا کہ سب سے اول جو چیز خدا تعالے نے بنائی وہ تنویری
ذرات ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں میں مسئلہ ہے کہ خدا نے اپنے
نور سے دنیا کو پیدا کیا۔ پھر وہ دیگر صفات مندرجہ قرآن پر

غور کرکے آسانی سے اُن قوانین کو دریافت کرلیتے جن کے ماتحت تنویری ذرات (نیبیولا) کام کرکے کائنات کی مختلف شکلیں بنا رہے ہیں۔ یہ امر بھی دراصل ہماری ارادہ کردہ کتاب کے موضوع کا ایک بڑا حصہ ہوگا جو دل چاہتا ہے کہ سر اَیڈورڈ لاج کی تازہ تصنیف کے جواب میں لکھی جائے۔ وما توفیقی الا باللہِ المستعان۔

یہاں مجھے بہ رعایت اختصار اسی قدر لکھنا ہے کہ جو نشاءِ عالم کی تشریح آج حکماءِ یورپ نے بیان کی ہے اُسے بدرجہا بہتر قرآن مجید نے واضح فرمایا ہے۔ ان حکما کی تحقیق کے موافق اور جن قوانین پر کائنات چل رہی ہے۔ وہ بعض صفات الٰہیہ کے ہی مقتضیات ہیں۔ اگر خدا کی کل صفات مندرجہ قرآن مجید کو سامنے رکھا جائے۔ اور اُن کی روشنی میں قوانین فطریہ کا مطالعہ کیا جائے تو ہماری تحقیق کی راہ بہت آسان ہوجائیگی۔ جہاں ہم خدا تعالےٰ کی صفت نور کو موادِ عالم کا باعث اولی ٹھیرائیں گے۔ وہاں باقی اسماء پر تدبر اور تفکر ہمیں کل قوانین فطریہ ظاہر کردیگا۔ اس امر کی تشریح میں اب یہاں میں ان چند دریافت شدہ قوانین پر

کچھ لکھنا چاہتا ہوں ۔ جن پر مختلف علوم سائنس بحث کرتے ہیں +

یہ امر گویا قرآن اور سائنس کا متفقہ ہے کہ کائنات کی ابتدائی شکل نیبولا یا ذرات تنویری ہیں ۔ لیکن جہاں سائنس اس بات کی تشریح کرنے سے رہ جاتی ہے کہ کیوں یہ ابتدائی ذرات خواص اضداد اپنے اندر رکھکر بباس الیکٹرون دوزرات برقی ہیں وہ دو متضاد چیزیں پیدا کر لیتے ہیں ۔ جسے مثبت اور منفی کہتے ہیں ۔ وہاں قرآنی نظام اسماء حسنٰے ہمیں ایک روشن راہ پر لے آتا ہے ۔ اس موقعہ پر میں جو لکھونگا وہ بطور اشارات ہوگا ۔ کیونکہ نہ یہاں لغات موجود ہیں نہ کتب سائنس ۔ قطعیت کے ساتھ انشاء اللہ العزیز جو کچھ لکھا جائیگا ۔ وہ انگلستان واپس جا کر لکھا جائیگا ۔ اگر فضل ربی شامل حال ہوگا +

اہل سائنس کے نزدیک یہ ایک متفقہ امر ہے کہ کائنات کے مختلف ہیولے جو کیمیا وی تراکیب مختلفہ سے پیدا ہوئے ہیں اس کا اصلی محرک قانون اضداد ہے ۔ یعنی ایک ہی قسم کی چیزیں ملکر کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوتیں ۔ بلکہ

اضداد ہی جمع ہو کر نتائج مطلوبہ پیدا کرتے ہیں۔ اگر منشاء عالم کے ذمہ وار اسمائے الٰہیہ قرار دیئے جائیں تو یہ امر اضداد بآسانی حل ہو جاتا ہے۔ ہم کتاب توحید میں بتفصیل یہ امر لکھ آئے ہیں۔ کہ خدائے تعالےٰ کی ہر صفت کے مقابل بطور نتیجہ ایک ضد موجود ہے۔ خیر و شر دراصل اسمائے الٰہیہ کے ہی اظلال و عکوس ہیں۔ سب کے سب اسمائے حسنہ خیر ہی خیر ہیں لیکن انہی کے نقیض میں جو چیز پیدا ہوتی ہے وہی شر ہے۔ چنانچہ ایک چیز کی پیدائش بعض حالات میں اس کی ضد کی پیدائش کا باعث ہوتی ہے۔ اس امر کے متعلق یہ بات بھی نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ خیر و شر یا دو اضداد کا وجود ایک امر اضافی ہے۔ ایک چیز جو ایک کے لئے باعث خیر ہوتی ہے وہی چیز دوسرے کے لئے باعث شر ہو جاتی ہے۔ حالات کے بدلنے پر کسی چیز کا خیر و شر ہونا بھی بدل جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہر ایک چیز جو دنیا میں پیدا ہو چکی ہے اور اس میں انسان کے اخلاق و جذبات بھی آجاتے ہیں۔ وہ خیر ہی خیر ہے۔ بشرطیکہ اپنے محل و موقعہ پر استعمال ہو۔ مگر جس وقت اس کا استعمال بے محل

ہوتا ہے شر ہو جاتی ہے۔ افیون اور سنکھیا مناسب مقدار میں اگر ضرورت پر آبحیات کا کام دیتے ہیں تو پھر بھی چیزیں سم قاتل بھی ٹھیر جاتی ہیں۔ پانی جو مایہ حیات ہے ہر ایک مستسقی کے لئے زہر ہلاہل ہو جاتا ہے۔ اس فلسفہ کو سب سے اول آکر قرآن کریم نے ہی سکھلایا کہ جو چیز خدا کی طرف سے ہے وہ وہ خیر ہی خیر ہے۔ مگر اپنا محل و موقعہ بدلنے پر وہ شر ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے نہ سمجھنے نے دنیا میں طرح طرح کے مذاہب اور عقائد پیدا کر دیئے ہیں۔ خالق شر اور خالق خیر کے تصور نے اہرمن اور یزدان پیدا کئے۔ تناسخ۔ کفارہ فنیلاہم یہ سب کے سب اسی مسئلہ کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوئے ہیں قرآن نے آکر خالق خیر کا پتہ دیا۔ اور یہ اطلاع دی کہ جس کا نام شر ہے وہ انسان کا اپنا فعل ہے۔ یہ سچ ہے کہ دنیا مجموعہ اضداد ہے۔ پھر بھی اضداد ایک دوسرے کے مقابل پڑکر خیر و شر ہو جاتے ہیں۔ لیکن بنفسہ وہ سب کے سب خیر ہیں۔ ہاں تبدیلئی حالات خیر کو شر کر دیتے ہیں۔ جیسے ایک وقت شر سمجھا جاتا ہے وہ دوسرے وقت خیر ہوتی ہے۔ اس لئے جہاں اسمائے الٰہیہ کا نظام مندرجہ قرآن حکیم

ہمیں یہ تعلیم کرتا ہے کہ اگر ایک اسم کے تقاضہ میں کوئی چیز پیدا ہوتی ہے تو اس کے الٹ میں ایک اور چیز بھی پیدا ہو جائیگی۔ یہ دونوں چیزیں ایک ہی قسم کے اظلال مختلفہ ہونگے۔ مگر یہ دونوں ظل اپنے اپنے موقعہ پر خیر ہی خیر ہیں بے موقعہ ان کا استعمال شر بن جائیگا۔ ہاں اس امر کا معیار تمیز خداتعالےٰ کی ایک اور صفت ہوتی ہے جو خدا کو اس امر سے منزہ کرتی ہے۔ یعنی اسم اللہ کے متقاضی اور منافی جو دو چیزیں پیدا ہونگی وہ بنفسہ مختلف حالات میں خیر ہو سکتی ہیں وہ شر اس وقت ہونگی جب کسی اور اسم الٰہی کی منشاء ان کے خلاف پڑیگی۔ مثال کے طور پر دن اور رات صفت نور کے دو اضدادی تقاضے ہیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونوں چیزیں فی نفسہ خیر نہیں۔ رات کو خداتعالےٰ نے ہمارے آرام کے لئے بنایا ہے +

لیکن ایک مغربیت زدہ انسان رات کے دو بجے تک جاگ کر صبح کے دس بجے تک سوتا رہیگا تو وہ دن اور رات دونوں کو اپنے لئے شر اور لعنت بنا لیگا۔ الغرض صفت نور نے اگر نور پیدا کیا تو اسی کی ضد میں ظلمت بھی پیدا ہو گئی۔ اور

یہ ظاہر ہے کہ ظلمت یعنی اندھیرا بذات خود اپنے محل پر رحمت ہی رحمت ہے۔ اگر خدا تعالےٰ نے والنہار اذا جلاّھا تو ساتھ ہی واللیل اذا یغشاھا فرمایا۔ دور کیوں جائیں۔ یہ جس قدر نباتاتی دنیا ہے اس کا نشوو نما ایک حد تک ظلمت شب سے وابستہ ہے۔ تمازت آفتاب جس قدر کاربن کو دن کے وقت دوسری چیزوں سے الگ کرتی ہے انہیں درخت اپنی خوراک رات کے وقت بناتے ہیں اب ہم کسے خیر کہیں اور کسے شر۔ یہاں تو نور اور ظلمت سر دو خیر ہی خیر نظر آتے ہیں۔ خدا تعالےٰ کی پیدا کردہ چیزوں کی بد استعمالی ہی کا نام شر ہے۔ اور یہ بد استعمالی دراصل اپنی کیفیات میں اسمائے حسنےٰ سے کسی ایک کی نقیض ہوتی ہے جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں +

از روئے تعلیم قرآن کریم جہاں اسمائے حسنے کے تقاضے مختلف قسم کی خیر کی شکلیں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ وہاں یہی تقاضے ان چیزوں کی ہلاکت کا باعث بھی ہوتے جاتے ہیں۔ جو انہی اسمائے کی ضدیں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ جیسے کہ ایک عاشق اپنے معشوق کی طرف اضطرار اً کھنچا چلا جاتا ہے

اسی طرح اسمائے حسنٰے کے اظلال اپنے نقیضات کی طرف کھنچے جانے میں مجبور ہیں۔ جہاں پہنچکر وہ شر کو کسی اور شکل میں خیر ہی خیر کر دیتے ہیں۔ اس سے وہ راز بآسانی کھُل جاتا ہے جو برقی مثبت اور منفی میں مضمر ہے۔ مثبت برقی ذرات اضطراراً منفی ذرات کی طرف جاکر ایک نئی چیز پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی نظام ہم روحانیات میں اظلال اسمائے حسنہ اور اُس کے نقیضات میں پاتے ہیں۔ یہ امر ہنوز فیصلہ طلب ہے کہ مثبت اور منفی ذرات میں کون مالک ہے۔ اور کس کا مٹنا برقی شرارہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن نظام روحانیات میں اظلال اسمائے حسنے اپنے نقیضات کے مالک ہوتے ہیں۔ اُن کے نقیضات مٹ کر ایک مفید چیز بن جاتے ہیں۔ اگر بالفرض ذرات مثبتہ کو اسمائے حسنے کے اظلال کہیں تو منفی ذرات اُن کے نقیض ہونگے۔ الغرض نشاءِ عالم کی تحقیق میں حکمائے متاخرین نے جو دو اضداد چیزوں کا ابتدائی سے ابتدائی حالت میں موجود ہونا بیان کیا ہے اور جس کو مثبت اور منفی کے نام سے موسوم کیا ہے وہ اسمائے الٰہیہ کے اظلال اور اُن اظلال کے نقیضات ہی ہیں۔ ہاں مثبت منفی ذرات کی کشش باہمی کا راز لوگوں پہ

پر آج کھلا ہے مگر اظلال اسمائے حسنہ اور ان کے نقیضات کی کشش باہمی از روئے تعلیم قرآن کریم مدت کی سمجھی سمجھائی ہوئی ہے الغرض ارادہ خداوندی نے جب کائنات کو پیدا کرنا چاہا اور مواد عالم کے لیئے صفت نور کام کرنے لگی تو ایک ہی ساتھ تنویر و تسوید دو فعل برابر ہونے لگے گویا صفت نور کے اظلال نے دو قسم کے ذرات پیدا کیئے یعنے تنویری ذرات اور تسویدی ذرات بالمقابل پیدا ہونے لگے۔ یہی نوری اور ظلمانی ذرات مواد عالم کی ابتدائی سے ابتدائی شکل ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وہ بالطبع ایک دوسرے کے اضداد ہیں ان متضاد جوہر ول کے ملنے نے پہلی ترکیب پر یا چند ترکیبوں کے بعد الیکٹرون پیدا کر دیئے۔ یہ امر مسلمہ سائنس ہے کہ نیبولا کے اندر وہ دونوں جوہر اضداد موجود ہیں جنہوں نے مثبت اور منفی برقی کی شکل اختیار کی۔ ان دو اضداد چیزوں کی پیدایش کی حقیقت سائنس خواہ کچھ بھی بیان کرے مگر وہ اس امر سے انکار نہیں کرسکتی کہ یہ دونوں ایک ہی فعل کے نیچے مساوی مقدار میں پیدا ہوئی ہیں +

ہم یہ ابھی لکھ آئے ہیں کہ اگر خدا کی ایک صفت نے نشاۂ

کائنات میں مواد کا کام دیا۔ تو اُس کی دوسری صفات نے وہ قوانین پیدا کر دیئے جن کے ماتحت اجزائے مواد تراکیب مختلفہ پا کر تخلیق کائنات کا باعث ہو گئے۔ ان قوانین کے متعلق بھی اب سائنس کا مذہب یہی ہے جو اسلام نے تعلیم کیا ہے ؛

ازروئے تحقیق جدید سب سے پہلا قانون جس کے ماتحت باقی بہت سے قانون آ جاتے ہیں لا آف گریوٹیشن یعنی قانون کشش ہے۔ اس سے اجسام مختلفہ ایک دوسرے کی طرف کھنچے جاتے ہیں۔ اس کشش کا دو ہمجنس چیزوں کو جمع کرنا تو ایک امر طبعی ہے۔ لیکن یہ کشش نہایت شدت کے ساتھ اُن دو اجسام کے ملانے میں بھی ظاہر ہوتی ہے جن کے خواص ایک دوسرے کے متضاد ہوں۔ اس کی بناء وہی منفی مثبت برقی طاقتیں ہیں۔ جو ہر ایک چیز میں موجود ہیں۔ وہی خواص متضاد پیدا کرتی ہیں۔ وہی جامع متضاد ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر آ اور ب دو چیزیں ہیں۔ آ میں بالفرض مثبت برق کی اسی اکائیاں موجود ہیں۔ اور ب میں منفی برق کے ساٹھ احاد موجود ہیں۔ اب اگر آ اور ب کو باہم اکٹھا کر دیں۔ تو آ۔

میں کی ساٹھ مثبت اکائیاں ب کی ساٹھ منفی اکائیوں کی کی طرف دوڑ جائینگی۔ یہ جذب جو مثبت اور منفی میں واقع ہوا اسی سے وہ انحراف یا جدائی بھی اسی وقت پیدا ہو جائیگی جو اکے ساٹھ مثبت اکائیوں نے بقیہ بیس اکائیوں سے کی۔ اس لئے قانون کشش جہاں شدت سے کام کرتا ہے وہ وہی مقام ہوتا ہے جہاں دو مختلف خاصیت کی چیزیں جمع ہوں۔ اور ان کی ترکیب سے کوئی نئی چیز پیدا ہونی ہو۔ اس ملاپ سے پہلے ہمجنس چیزیں بھی اسی قانون کشش کے ماتحت ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس وقت قانون کی اس شکل کا نام کشش انضال ہوتا ہے۔ لیکن جب دو قسم کی متضاد چیزیں اپنی ہم جنس جماعت کو چھوڑ کر ایک نیا نتیجہ پیدا کرنے کے لئے آپس میں ملتی ہیں تو اسے قانون کشش کیمیاوی کہتے ہیں۔ اور جس وقت یہ قانون عمل کرنے لگیگا تو اسی وقت ہمجنس ذروں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا بھی واقع ہونے لگیگا۔ اس قانون کو Law of Repulsion یعنی قانون سالبہ کہتے ہیں

الغرض ایک قانون کشش سے یہ تین اور قانون پیدا ہو گئے یعنی کشش انضال۔ کشش کیمیاوی۔ قانون سالبہ۔

بہتر ہوتا کہ اس قانون کشش کیمیاوی کا نام کشش زوجیت رکھا جاتا۔ رشتہ زوجیت کے پیدا کرنے کے لئے دو ملنے والے اجسام کا مختلف الجنس ہونا لازمات سے ہے۔ بلکہ لفظ زوج کے معنوں میں غیر جنسیت کا اشارہ موجود ہے۔ تزویج وہیں ہوگی جہاں افراد زوجیت غیر متجانس ہونگے۔ کس قدر عظیم الشان حقایق کا ایک سائنٹفک آدمی مالک ہو جاتا ہے! اگر وہ قرآن کے ان حقائق کو سامنے رکھ کر باب تحقیق کھولے۔ ایک طرف قرآن کا کہنا۔ یعنی جو کچھ بھی کائنات میں ہے وہ زوج کے رنگ میں ہے۔ یعنے ہر ایک چیز کا جوڑا موجود ہے جس سے اُسے مل کر ایک اور چیز پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف عربی زبان کا لفظ زوج کے مفہوم میں غیر جنسیت کو ایک لازمی حصہ قرار دینا ہمیں آسانی سے اسی نتیجہ پر لا سکتا تھا جس پر قایم ہونے کے قریب آج دنیا ہو چکی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کل دنیا و ما فیہا میں رشتہ زوجیت دائر و سائر ہے۔ اسی رشتہ کے ماتحت چیزیں مل کر نئی سے نئی چیزیں پیدا کرتی ہیں۔ اور یہ رشتہ مادہ کی ابتدائی سے ابتدائی شکلوں میں بھی موجود ہے۔ اب جیسے کہ بیان

ہو الغرض قیام زوجیت کے لئے غیر مجانست لازمًا ٹھیرائی ہے تو قرآنی آیت ایک طرف اور لفظ زوج دوسری طرف فی الفور ایک محقق کو اس نتیجہ پر لے آئیگا کہ مواد کائنات کی پہلی سے پہلی شکل میں بھی دو اجزائے غیر متجانس ہیں اور اُن کے ملنے کا ذریعہ اُن کی غیر جنسیت ہی ہے۔ یہ سارے مثبت منفی کے جھگڑے اس ایک حقیقت میں آجاتے ہیں +

میں یہاں جملہ معترضہ کے طور پر ایک اور بات لکھتا ہوں۔ اور سائنٹفک دنیا کو اس امر کی طرف متوجہ کرتا ہوں کہ اگر ابتدائی زوجیت برقیہ کی بنا مثبت اور منفی برق ہے اور حسب تعلیم قرآن آج کل کائنات اسی رشتہ میں مربوط مانی گئی ہے تو کیوں کل کائنات کو مذکر و مونث قرار دیکر بھی منفی مثبت برق کو تذکیر و تانیث کی وجہ تمیز نہ ٹھیرائی جائے۔ درختوں میں سے مذکر مونث تشخیص کر لینا مشکل نہیں۔ چند مثالیں لیکر اگر کیمیاوی تفریدو تجرید کے ماتحت یہ نظر آجائے کہ بالفرض جو درخت مذکر ہیں ان میں اجزائے مثبت زیادہ ہیں اور مونث درختوں میں اجزائے منفی۔ اور پھر عورت اور مرد کے

نطفوں کی تحقیق کرکے بھی اگر یہ ہی نتیجہ نکل آئے تو اجسام
عالم میں تذکیر و تانیث کی تمیز کی راہ یقیناً نکل آئیگی۔ اس تحقیق
کی تسہیل کے لئے میں قرآن مجید کے ایک اور اشارہ کا حوالہ
دیتا ہوں۔ قرآن مجید نے والسماء ذات الرجع والارض
ذات الصدع کہکر اشارہ کیا ہے کہ جو چیزیں آسمان
سے آتی ہیں ان میں قوت فاعلی اور جو زمین میں ہیں اُن میں
قوت انفعالی ہے۔ اس آیت کے ماتحت سماوی اجزاء
اشیاء کائنات مذکر ٹھیرتے ہیں۔ اور ارضی اجزاء مونث
ان چیزوں کو بھی اس اصول سے زیر تحقیق لایا جاوے۔ پھر
اور ایک لطیف بات جو عربی زبان میں ہے وہ یہ ہے۔ کہ
کائنات کی ہر چیز کو عربی زبان نے مذکر یا مؤنث کہا ہے۔
اس سے بھی تحقیق کی راہ کسی حد تک آسان ہو سکتی ہے مثلاً
عربی زبان سورج کو مؤنث اور چاند کو مذکر کہتی ہے۔ اب
اگر روشنی قمر کے ذرات اور شمسی ذرات میں ما بہ الامتیاز کی
تلاش کی جائے تو یہ بھی اس تحقیق میں امداد دیگی۔ یہ امر بھی
مسلم ہے کہ ابتداء عالم مثبت منفی ذرات برق کی ترکیب سے
ہوئی ہے۔ تو ان میں سے ایک کو مذکر اور ایک کو مؤنث

سمجھ کر تحقیق محولہ بالا میں امداد لی جا سکتی ہے۔ ہاں نور کو حسب تعلیم قرآن مواد عالم ظاہر کر میں آسانی سے کہہ سکتا ہوں کہ ذرات تنویری مذکر اور ذرات تسویدی مؤنث ہیں میرے یہ کہنے کی وجہ مذکورہ بالا تعلیم قرآن ہے۔ چونکہ نور کو آسمان سے تعلق ہے اور ظلمت کو زمین سے اس لئے والسماء ذات الرجع کی حقیقت ذرات کو تنویری مذکر بناتی ہے۔ لہذا مثبت اور منفی ذرات میں سے جو بھی بجلی میں روشنی کی خاصیت پیدا کرے وہ ہی مذکر ہے۔ میں یہ بے سود باتیں نہیں لکھتا۔ آج انسان اگر ان حقائق کو سمجھ لے تو پھر وہ مذکر یا مؤنث کے پیدا کرنے میں خلیفۃ اللہ بن سکتا ہے ان سطور کے مخاطب خصوصاً مسلمان سائنس دان اصحاب ہیں +

اب ہم اصل بحث کی طرف آنے سے پہلے یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ اگر جسمانیات میں قانون کشش کام کرتا ہے تو ادراکیات میں اس کے مقابل قانون محبت کام کرتا ہے اور لطف یہ ہے کہ جسمانیات و ادراکیات میں دونوں جگہ ایک ہی طریق پر ان دونوں قانونوں کا عمل ہوتا ہے جب

طرح قانون کشش دو غیر متجانس چیزوں کے جمع ہونے پر ان کو جس زور سے ملاتا ہے۔ اسی وقت اُسی زور سے متجانس چیزوں کو جو پہلے ملے ہوئے ہیں جدا کر دیتا ہے۔ یعنے اس سے وصل اور فصل دونو پیدا ہوتے ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح محبت کا رنگ ہے۔ اس میں بھی دو غیر متجانس اشخاص کے وصل پر پہلے ملی ہوئی متجانس چیزوں میں فصل ہو جاتا ہے۔ کمال محبت وہی ہے جس میں جامعیت اور مانعیت دونو رنگ ایک ہی وقت میں ہوں یعنی دل سارے کا سارا ایک کیطرف کھنچکر دوسرے سے بکلّی الگ ہو جاوے۔ یہ کیفیات جسم و ادراک اس امر کا بدیہی ثبوت ہیں کہ اجسام میں کشش دراصل محبت کا ہی دوسرا نام ہے۔ اور ہر دو کے نتائج عمل بھی ایک ہی ہیں *

لہذا اگر صفت نور نے مواد عالم (ہنیبولا) پیدا کیا ہے تو خدا کی صفت محبت نے "قانون کشش" خلق فرمایا اور اس امر کی طرف حدیث ذیل بھی اشارہ فرماتی ہے۔ اس "قانون کشش اور اس کے ماتحت قانون کشش کیمیاوی اور قانون سالبہ کے بالمقابل محب اسماء الٰہیہ میں بھی نہیں

صفات نظر آتی ہیں الودود۔ المانع۔ الجامع ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اگر صفت نور نے کائنات کے لئے مواد بہم پہنچایا تو باقی صفات الٰہیہ نے وہ قانون پیدا کئے ہیں جنہوں نے اس مواد پر کام کرنا شروع کیا۔ اب تک قوانین فطریہ کی دریافت میں سائنس کی تحقیق نامکمل ہے۔ نہ تو کل قوانین ہی دریافت ہوئے ہیں نہ دریافت شدہ قوانین میں مناسب جماعت بندی ہوئی ہے۔ ہاں جو چند قانون تشخیص کئے گئے ہیں اُن کا عمل قریب قریب وہی ہے جو بعض صفات الٰہیہ کا عمل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ذیل میں اُن بعض دریافت شدہ قوانین کے مقابل صفات الٰہیہ لکھ دیتے ہیں:۔

قانون	معنی	اسم الٰہی
Law of Gravitation	قانون کشش	الودود
Law of Tension & Cohesion	قانون کشش اتصال	الجامع
Law of Repulsion	قانون سالبہ	المانع
Law of Uniformity	جس قانون کے ماتحت چیزیں اپنی اپنی حیثیت قایم رکھتی ہیں	القیوم
Law of Contraction	جو چیزوں کو سکیڑتا ہے	القابض

Law of Dilation	جو چیزوں کے ذرات کو کھولدے	الباسط
Law of Conduction	جس کے ماتحت بعض چیزیں بعض میں سرایت یا نفوذ کر جاتی ہیں	اللطیف
Law of Causation	قانون علل	الباعث
Law of Conservation	جس کے ماتحت مادہ فنا نہیں ہوتا	الباقی
Law of Equilibrium	قانون توازن	العدل
Law of Harmony	قانون ہم آہنگی	السلام
Law of Periodical	جس کے ماتحت چیزوں میں میعادی کیفیات پیدا ہوں	المقسط
Law of Reversion	جس کے ماتحت چیزیں اصلیت کی طرف رجوع ہوں	المعید

میں نے یہ چند قوانین اور مثالیں جو کتب حوالہ جات کی اس بے سروسامانی میں یہاں لکھ دی ہیں۔ یہ بطور تشریح اصول لکھی ہیں نہ برنگ تحقیق۔ اول تو خود اہل سائنس نے قوانین فطریہ کو منضبط نہیں کیا۔ پھر اگر نیچر کے بعض کارناموں میں کوئی اصول کام کرتا نظر آیا ہے تو اس کے لئے ابھی تک کوئی نام تجویز نہیں ہوا مثلاً ایک حالت سے دوسری

حالت میں جب کوئی مادہ کی شکل جاتی ہے تو جو قوت کام کر رہی تھی وہ یک لخت اندر ہی اندر غائب ہو جاتی ہے اور پھر جب نئی حالت پیدا ہوتی ہے تو غائب شدہ قوت یک لخت ظاہر ہو جاتی ہے۔ برف سے پانی اور پانی سے تبخیر بننے میں جو حرارت خرچ ہوتی ہے وہ ایک مقام پر غائب ہو جاتی ہے۔ جسے حرارت مخفی کہتے ہیں۔ اب یہ اصول صرف پانی پر ہی حاوی نہیں بلکہ ہر ایسی چیزوں میں جو شکل و خواص میں تبدیلیاں کیا کرتی ہیں چلتا ہے۔ مقام تبدیلی شکل پر کارکن قوت کا غائب ہو جانا اور نئی شکل کے پیدا ہونے پر اس کا ظاہر ہو جانا تجربہ میں آچکا ہے۔ کسی چیز کا تخم بوئے جانے پر اول اس کا پھٹنا شروع ہوتا ہے۔ پھر صورت تخمیت زائل ہوتی جاتی ہے۔ جب یہ فعل بھی مکمل ہو جاتا ہے تو مزید ترقی بند ہو جاتی ہے یعنے نظر نہیں آیا کرتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تخم مرگیا اور اس سے اب کچھ پیدا نہ ہوگا۔ لیکن قوت روئیدگی اندر ہی اندر کام کرتی رہتی ہے۔ جو کونپل کے نکلنے پر یک لخت پھر ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح رحم میں جنین کے مختلف بلوغی منازل میں ایک منزل کے اختتام

اور دوسری منزل کے آغاز پر قوت نمو یک لخت کچھ وقت کے لئے غائب معلوم ہوتی ہے۔ اس کی بہترین مثال کیٹر پلر (گوبھی کا کیڑا) کی موت اور تیتری کی پیدائش کا درمیانی وقفہ ہے جہاں قوت نمو بالکل چھپ جاتی ہے۔ یہ ایک قسم کا رنگ برزخیت ہے۔ مجھے خیال نہیں پڑتا کہ اس کیفیت خفا و ظہور کے لئے کوئی نام تجویز ہوا یا نہیں۔ لیکن خدا کے جن اسماء کو ان سے تعلق ہے وہ الظاہر اور الباطن ہیں اسی طرح وہ قانون جس کے ماتحت ہر ایک چیز اپنے کمال تک پہنچنے میں مقررہ راستہ پر جاتی ہے اور ایسے جانے کی استعداد اس میں بطور وجدان (INSTINCT) رکھی ہوتی ہے اُسے خدا کی صفت الہادی سے تعلق ہے +

میں اس مقام پر مسلم سائنس دانوں کو متوجہ کرتا ہوں کہ وہ اپنے متقدمین کی طرح اسمائے الٰہیہ کی مشعل ہاتھ میں لے کر میدان تحقیق کی ظلمانی وادیوں میں نکل جائیں وہ اب بھی اس طریق پر تحقیق کرنے سے جن نتائج پر آئیں گے وہ دنیا کو حیران کر دینگے +

مختلف کیفیات کائنات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے

کہ جس قدر صفات الٰہیہ قرآن میں درج ہیں جو امور قرآن مجید خدا کی طرف منسوب کرتا ہے تقریباً اُن سب کا عکس ہمیں نیچر میں نظر آتا ہے۔ اور جو باتیں قرآن نے لفظ اللہ سے منسوب کی ہیں۔ اُن کے خط و خال بحیثیت مجموعی کائنات میں بھی نظر آتے ہیں یعنی اگر مختلف صفات الٰہیہ فرداً فرداً مختلف اشیائے کائنات میں نظر آتی ہیں تو کل کائنات کا بحیثیت مجموعی جو انداز ہے اُس کو خدا کے اسم ذات کی طرف قرآن منسوب کرتا ہے مثلاً نیچر کے بعض منظر یا بعض چیزیں اپنی خوبصورتی میں جمیل کا رنگ اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ بعض عناصر رنگ قہاری دکھلاتے ہیں۔ بعض مظاہر قدرت میں متکبر جبار۔ متین کی شان نظر آتی ہے۔ چیزیں مرتی ہیں۔ پھر دوبارہ پیدا ہوتی ہیں جس سے المحی الممیت نظر آتا ہے۔ قوانین فطریہ کے توڑنے میں بعض وقت نیچر ہمیں فی الفور سزا دیتا ہے۔ بعض وقت اُس کی طرف سے بظاہر کوئی مخالفت نہیں ہوتی یہی رنگ سریع الحساب اور خدا کی شان صبوریت میں ہے۔ اسی طرح ہم اوپر دکھلا چکے ہیں کہ کسی چیز سے عیب دور کرنے میں جو عمل کہ مٹی۔ پانی۔ اور آگ کا ہوتا ہے۔ وہی تین رنگ حلم۔ عفو

اور قہاریت میں جلوہ نما ہیں۔ دن یا سورج میں اگر الظاہر اور الباسط کا نقشہ ہے تو رات اور ایسا ہی چاند میں ستار الباطن اور القابض کی شان نظر آتی ہے۔ اب میں ذیل میں وہ چند اصول لکھتا ہوں جو کائنات میں عام طور سے نظر آتے ہیں۔ اور اس کے مقابل وہ سُنن الٰہیہ بھی لکھ دیتا ہوں جن کی تعلیم قرآن حکیم نے فرمائی ہے +

صفات کائنات	وسنن الٰہیہ
کائنات کی ہر نقل و حرکت میں اندازے اور حدود مقرر ہیں	قدیر
قوانین فطریہ میں تبدیلی نہیں ہوتی	ولن تجد لسنت اللہ تبدیلا
نیچر کے مقرر کردہ حدود کا توڑنا خلاف منشاء کائنات ہے	ان اللہ لا یحب المعتدین
کوئی عمل انسان کا متعلقہ کائنات بے نتیجہ نہیں ہوتا	ان اللہ لا یضیع اجر العاملین
قوانین فطریہ کے مطابق نیچر کے کل وعدے صحیح ہوتے ہیں۔	ان اللہ لا یخلف المیعاد
کائنات کی برکات احاطہ میں نہیں آتیں	وان تعدو نعمت اللہ لا تحصوھا

صفات کائنات	صفات وسنن الٰہیہ
اگر ہم خلاف ورزی قانون چھوڑ دیں تو نیچر کی طرف سے بد نتائج بھی رک جاتے ہیں	وان عدتن عدنا
اگر خلاف ورزی قانون چھوڑتے جائیں تو گذشتہ غلطی سے پیدا شدہ اثرات بد بھی زائل ہوتے جاتے ہیں	غافر الذنب وقابل التوبۃ
جس قدر ہم کائنات میں کوشش اور غور کریں اسی قدر اسکے اسرار ہم پر کھلتے جاتے ہیں۔	والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا
خلاف ورزی قوانین ہمیں کسی صحیح طریق پر پہنچنے نہیں دیتی	ان اللہ لا یھدی القوم الفاسقین
اور نہ ایسے شخص کو کچھ مدد مل سکتی ہے	وما للظالمین من انصار
چیزیں پرانی ہونے پر اپنے خواص کھو دیتی ہیں ناقص ہو جاتی ہیں	ومن نعمرہ ننکسہ فی الخلق
نیچر چیزوں کو مٹاتی ہے اور پھر پیدا کرتی ہے۔	یحیی ویمیت

صفات کائنات	صفات وسنن الٰہیہ
کائنات[1] کی مختلف اشیاء مٹیں یا فنا ہوں لیکن مواد کائنات دراصل قایم رہتا ہے	کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام
اگر ہم اپنی فطرت کو غلط راہ پہ چلائیں تو آہستہ آہستہ ہماری فطرت سے غلط راہ کی مخالفت مٹ جاتی ہے اور آہستہ آہستہ بری بات ہی ہماری فطرت کو پسند آنے لگتی ہے۔	فی قلوبھم مرض فزادھم اللّٰہ مرضا
ہم پہ ہر ایک منظر قدرت کا عمل ہماری اپنی استعداد کے مطابق نیک یا بد ہوتا ہے	یضل بہ کثیراً و یھدی بہ کثیرا وما یضل بہ الا الفاسقین
اگر ہم قانون فطرت کی پوری اطاعت کریں تو ہمارے ثمرات لامحدود ہو جائیں	الذین امنوا وعملوا الصلحت و لھم اجر غیر ممنون
کائنات آٹھوں پہر کوشش کرتی ہے کہ ہر ایک چیز اپنی حیثیت پر قایم رہے	واللّٰہ یحب المقسطین

[1] ہم اس بات کے قایل نہیں کہ نیچر کے لئے فنا نہیں۔ کائنات دراصل ہر رنگ میں ایک حد تک اپنے صانع کی صفات کا مظہر ہیں اس لئے کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام کا رنگ بھی ظلی طور پر اسمیں نظر آتا ہے۔ اس قول کو اصل قائل ﷺ نے ہی دنیا میں سب سے پہلے دہشت پیدا کردی کہ اور سورج پرستی کی بنیاد شیخ سعدی علیہ الرحمۃ معروف

انسان اگر مزید غور کرے تو قرآن کریم سے کائنات کے کل قانون نکال سکتا ہے۔ اسی طرح وہ کونسی صفت الہیہ مندرجہ قرآن ہے جس کا رنگ کائنات کی مختلف چیزوں میں نظر نہیں آتا۔ المصور۔ الخالق۔ الخافض۔ الرافع المجیب۔ النافع۔ الوارث۔ النصار۔ الغنی الحسیب الحفیظ۔ الشہید۔ الوکیل۔ القوی۔ الولی۔ المقدم المؤخر سب کے سب اپنی جلوہ آرائیاں مختلف اشیائے عالم میں کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ قوت (انرجی) کا وہ رنگ جو ایک حالت سے دوسری حالت میں جانیوالی اشیا میں پہلی حالت کے انجام اور دوسری کے آغاز کے درمیانی وقفہ میں ظاہر ہوتا ہے یعنی قوت کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اور اندر ہی اندر غائب ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم ابھی لکھ آئے ہیں۔ یہ غیبوبیت قوت کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن الباطن کا یہ ایک رنگ ہے۔ ام الصفات بروئے تعلیم قرآن چار ہیں۔ رب۔ رحمن۔ رحیم۔ مالک یوم الدین رب کے چاروں افعال یعنی خالقیت۔ قیومیت۔ رزاقیت خالقیت یا باسطیت کا کائنات میں موجود ہونا ہم اوپر دکھلا

چکے ہیں۔ رحمٰن کی طرح کائنات نے ہمارے مایحتاج ہماری پیدائش سے پہلے پیدا کر رکھے ہیں۔ یہ عطیہ کائنات ہمارے کسی عمل کے عوض میں نہیں ہوتا جیسے کہ شان رحمانیت کا تقاضا ہے۔ قانون فطریہ کے ماتحت ہم جو کام کریں اسکے مقابل ہمارے ثمرات بے انداز ہوتے ہیں اور یہ رنگ شان رحیمیت کا ہے۔ حسب تعلیم قرآن مجید مالک میں ہم نے تین رنگ دیکھے ہیں۔ ہر عمل کے بالمقابل ایک نتیجہ اسی صفت کے ماتحت ہوتا ہے۔ عمل خیر یعنی پیروی قانون کا نتیجہ تو لازماً ہوتا ہے۔ لیکن عمل بد یا خلاف ورزی قانون کے مکافات کبھی ملتے ہیں اور کبھی معاف ہو جاتے ہیں۔ نیچر میں بھی یہی رنگ ہے۔ نیچر کی اطاعت میں تو لازماً فائدہ ہوتا ہے لیکن خلاف ورزی قانون فطرت سے کبھی نقصان ہوتا ہے اور کبھی کوئی بد نتیجہ محسوس نہیں ہوتا۔

الغرض یہ امر بالبداہت نظر آتا ہے کہ کل کی کل کائنات میں صفات الٰہیہ کا رنگ ہے۔ اسی کے صفات مختلفہ نے فرداً کہیں مواد۔ کہیں قوانین۔ کہیں خواص فطریہ کی شکل اختیار کی ہوئی ہے۔ بالمقابل یہ ہم دکھلا چکے ہیں کہ انسان کے اندر

کل ذرات عالم اور اُن کے خواص آ جمع ہوئے ہیں۔ انسان ایک عالم صغیر ہے۔ نہ صرف جسم اور جسمانی کیفیات کے لحاظ سے ہی بلکہ مذکورہ بالا بحث کو اگر سامنے رکھا جائے تو انسان اپنے اخلاق اور سیر کے لحاظ سے بھی عالم صغیر ہے۔ وہ سارے کے سارے قوانین جو عالم کبیر میں کام کر رہے ہیں وہ سب کے سب اس عالم صغیر میں برنگ اخلاق پائے جاتے ہیں۔ ہم اپنی کتاب توحید میں بالتفصیل یہ دکھلا چکے ہیں کہ اخلاق انسانی کل کے کل اخلاق الٰہیہ کا عکس ہیں۔ اور بحث بالا میں ہم یہ بھی دکھلا چکے ہیں کہ کائنات اور اشیائے کائنات میں جس چیز کا نام قوانین یا خواص فطریہ ہے وہ دراصل صفات الٰہیہ کی ہی جھلک ہے۔ دوسری طرف یہ بھی مسلم ہے کہ جس چیز کا نام انسان ہے وہ زمین سے نکلا ہوا ہے۔ لقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین۔

اب کیا ان سارے کے سارے قضایا کا صحیح منطقی نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا کہ صفات الٰہیہ کے اظلال ہی کائنات کی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئے۔ پھر وہ کل کی کل شکلیں آ کر انسان میں جمع ہو گئیں جو جسم انسانی کے اندر جذبات

بن گئیں پھر ان جذبات سے اخلاق متولد ہوئے۔ اور پھر یہ اخلاق ستودہ ہو کر آخر اخلاق الٰہیہ کی شکل میں آ گئے۔ سائنس نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ نیبولا نے مختلف شکلیں اور ہیولے بدل کر اپنے آپ کو زمین کی صورت میں ظاہر کیا۔ پھر اُس سے نکل کر وہ جسم انسانی میں جلوہ گر ہوا۔ اس تحقیق سائنس سے ہمیں انکار نہیں۔ اس پر ہم صرف اس قدر اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ خدا کی صفت نور سے نیبولا بنا اور اس کی دوسری صفات نے اس میں خواص کائنات پیدا کر دیئے جیسا کہ ہم ثابت کر آئے ہیں۔ اسی طرح نیبولا ان صفات الٰہیہ کے ساز و سامان کے ساتھ جسم انسانی میں ظاہر ہوا۔ اور آخر کار صفات الٰہیہ کی اُس شکل میں مبدل ہو گیا جس سے خلق کائنات ہوئی۔ نیبولا نے انسانی لباس میں جدا جدا دو کیفیات پیدا کر لیں۔ ایک کیفیت جسمانیات اور دوسری کیفیت ادراکی۔ یہ دو کیفیات نیبولا کے ہر ارتقائی شکل و صورت میں پائی جاتی ہیں۔ انسانی شکل میں جسے ہم ادراک یعنی اس کے اخلاق و جذبات کہتے ہیں یہ وہی خواص و قوانین فطریہ ہیں جن کا عمل دخل مادر لائے

انسانی دنیا میں بھی ہے مثلاً جسے ہم انسان کے اندر محبت کہتے ہیں اسے ہم غیر ذی روح اشیاء میں کشش کہتے ہیں الغرض صفات الٰہیہ کے اظلال نے ہیبولا میں پہلی جسمانی شکل اختیار کی پھر جب جسم نے انسانی خلقت میں تکمیل اختیار کر لی تو اس سے خلق نکلے جو تا ثرات جسم سے خالی نہیں ہوتے۔ ہاں یہ اس وقت اخلاق الٰہیہ کا جامہ پہن لینگے جب یہ کل جسمانی کیفیات سے الگ ہو جائینگے +

مسئلہ "ہمہ اوست" اور حکیم ہیکل کے مسئلہ LAW

SUBSTANCE کی بحث میں ہم دکھلا چکے ہیں کہ گو کائنات کی فطرت میں قانون پر چلنا ہے۔ لیکن قانون اس کے اندر نہیں ہے یعنی کائنات میں مواد اور استعداد پیروی قانون تو موجود ہے۔ لیکن قانون کا علم یا اس کی ہدایت باہر سے آئی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قانون کل کائنات کو تو چلا رہا ہے۔ اور کائنات میں بمنزلہ روح اور جان کے ہے لیکن کائنات سے باہر ہے۔ جو چیز کائنات میں ہے۔ وہ استعداد پیروی قانون ہے۔ اور اسے ہم ظل قانون کہتے ہیں جو قانون سے الگ چیز ہے۔ یہ ہم دکھلا چکے ہیں کہ کل کے کل قانون

اور خواص جو کائنات پر حکمران ہیں وہ صفات الہیہ سے نکلے ہوئے ہیں لہذا
یہ امر صفائی کے ساتھ ثابت ہو گیا کہ اگرچہ خدا تعالے اپنی
تمام صفات کے ساتھ کائنات میں بمنزلہ روح کائنات
کام کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن وہ کائنات سے الگ ہے
اُس کے سارے کے سارے صفات کائنات میں
بمنزلہ جان تو ہیں لیکن وہ کائنات سے بالکل الگ ہے۔
لہذا وہ چیز جو کائنات کی کل چلا رہی ہے وہ صفات خداوندی
نہیں بلکہ اُن کے اظلال ہیں۔ اُن دو باتوں میں تمیز نہ کرنے
نے اگر ایک طرف دہریئے پیدا کئے تو دوسری طرف "ہمہ
اوستی"، "ویداتتی"، اور آج کل کے تھیاسوفسٹ بنائے۔

ہم اپنا جان و مال اور وہ کیا چیز ہے۔ کل کی کل دنیا اگر
ہمارے بس میں ہو تو محمد جیسے مکرم اور محسن (علیہ الف الف
صلوٰۃ) اور اس کی تعلیم پر قربان کر دیں۔ اور دنیا کو ان کے حلقہ
بگوش بنانے کی کوشش میں خرچ کر دیں جس کے طفیل دنیا
میں قرآن نازل ہوا۔ اور قرآن نے حقیقت توحید کی باریکیوں
کو سمجھانے کے لئے صفات الہیہ کا یہ نظام باندھا۔ اس سے
بڑھکر اور کیا حقانیت اسلام کے ثبوت میں کہا جا سکتا ہے

کہ جس نے تہذیب و تکمیل نفس انسانی کے لئے بعض مذاہب سابقہ کی طرح توحید کی نہ صرف تعلیم ہی دی۔ بلکہ ساتھ ہی ہمپر یہ حقیقت بھی منکشف کردی کہ ایمان بہ توحید کس طرح جسمانیات اخلاق۔ روحانیات۔ تمدن۔ تہذیب دریافت علوم وغیرہ میں ہمارا خضر راہ ہو سکتا ہے۔ منظاہر قدرت کے نقشے ہمارے سامنے لاکر ہمیں یہ یقین دلایا کہ اگر خدا ایک نہ ہوتا تو نیبولا سے چل کر تکمیل نفس انسانی تک نہ ایک ہی اصول پر حکومت ہوتی اور نہ ایک ہی قسم کے قوانین کام کرتے۔ ایسا ہی سب مناظر فطرت کو ہمارے سامنے لاکر یہ دکھلا دیا کہ خدا ہے۔ خدا اور کائنات دو الگ چیزیں ہیں۔ خدائے کائنات عیسائیوں کا خدا نہیں جو کفارہ جیسی تعلیم کرے۔ کیونکہ تم کہیں کائنات میں ایسے خدا کا پتہ نہ پاؤ گے جو اعلے کو ادنی پر قربان کردے۔ یا ایک کا بوجھ دوسرے پر ڈال دے وہ خدائے آریہ نہیں جو تناسخ کا قانون باندھے۔ وہ خدائے آتش پرستاں نہیں جو یزداں واہرمن کا رنگ اختیار کرے الغرض انسان کا معبود اگر کوئی خدا ہے تو وہ وہی خدا ہے کہ جس کی صفات کی شہادت کائنات کا ذرہ ذرہ دے رہا

ہے۔ اور اس شہادت پر ہم نہایت وثوق سے کہتے ہیں کہ یہ وہی خدا ہے جس کا پتہ ہمیں قرآن نے دیا ہے۔ یہ وہی خدا ہے جس کی صفات کے اظلال نے کائنات کی شکل اختیار کی جس کے اخلاق کے آثار کرۂ ارضی میں آجمع ہوئے جس کے اخلاق نے ان کونی شکلوں سے صعود کرکے جب وہ پہلی شکل اختیار کرنی چاہی جس نے ابتداءً نیبولا بنایا تھا تو اس کرہ میں بھی جگہ لی جس کا نام قلب انسانی ہے۔ وہاں اُن کا نام جذبات نفس ہوا جن کے مجموعہ کا نام ادراک انسانی ہے۔ ان میں سے وہ صعود کرکے جسمانی کیفیت سے جب بالکل الگ ہو جاوینگے تو اُن میں اُن کا وہ ابتدائی رنگ پیدا ہو جاویگا۔ جسے انسان متخلق باخلاق اللہ کہلا سکے۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ صفات الٰہیہ کائنات میں بمنزلہ روح وجان ہوکر بھی پھر کائنات سے الگ ہیں۔ اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ وہ حاکم ہیں محکوم نہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس وقت مدرکہ انسانی جو جسم انسانی میں بمنزلہ جان و رُوح ہے جسم کے تصرف سے الگ ہو جائیگا۔ اور جسم کا حاکم

ہوگا اور محکوم نہیں رہیگا۔ اس وقت یہ مدرکہ اعظم کا کامل ظل ہوگا۔ تشریح کے طور پر میں ایک مختصر مثال دیتا ہوں۔ اگر ایک بچہ کے جسم کے کسی حصہ کو ایذا پہنچے مثلاً کوئی سختی سے چٹکی لے تو اس کا غصہ مشتعل ہو جائیگا۔ لیکن جس شخص کو اپنی طبیعت پر قابو ہے اس کے جسم پر بھی سخت سے سخت ایذا بیجا طریق پر پہنچے تو وہ موذی چیز کو تو دفع کریگا لیکن شان متانت اسی میں ہے کہ اس کے ابرو پر بل نہ آئے اسکے چہرے پر خشم کے آثار ظاہر نہ ہوں۔ جسم دونوں صورتوں میں دردمند تو ہوا۔ لیکن جہاں صورت اول میں وہ غصہ کو مشتعل کر سکا ہے وہاں صورت ثانی میں غصہ کو مشتعل نہیں کر سکا۔ اس کے بالعکس بچہ یا کسی ناتربیت یافتہ انسان کے غصہ کے آثار جسم پر اپنا اثر کلیتہً ڈالتے ہیں۔ لیکن ایک مہذب انسان کا غصہ چہرہ پر بہت کم ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دو حالتیں اس بات کو دکھلاتی ہیں۔ کہ صورت اول میں جہاں غصہ جسم پر اور جسم غصہ پر اثر ڈالتا ہے وہاں صورت ثانی میں نہ غصہ جسم سے نہ جسم غصہ سے متاثر ہوتا ہے۔ صورت اول میں جسم اور غصہ میں امتزاج ہے

مگر صورت ثانی میں وہ رشتہ نہیں رہا۔ اب قہر جسم سے الگ ہوگیا اور جسم کی کوئی حکومت اس جذبہ پر نہیں رہی۔ جبتک یہ خلق قہر انسان کے قلب میں حیوانی قہر کی خوبو لئے ہوئے تھا اس وقت تک وہ جسم سے ملا جلا تھا۔ جسم قہر کے تابع اور قہر جسم کے تابع تھا۔ لیکن تہذیب نفس نے ان دونوں کو الگ الگ کر دیا۔ اب وہ جسم اور جسم کے متقاضی جذبات کی اطاعت سے نکل چکا ہے۔ وہ بوقت ضرورت جسم پر حکومت کرکے ان سے کام لیتا ہے۔ لیکن اس حیثیت میں آگیا ہے کہ گویا وہ جسم سے باہر ہے۔ یہ وہ شکل ہے جس کا نام ربانی قہر ہے جس طرح خداوند کی صفت قہر حسب تصریح بالا عالم کبیر میں بمنزلہ روح کام کرتی نظر آتی ہے مگر اس عالم سے الگ بھی ہے اسی طرح یہ قہر حسب ضرورت عالم صغیر یعنی جسم انسانی میں بمنزلہ روح کام تو کرتی ہے لیکن اب جسم سے الگ ہے۔ اب اس پر صبغۃ اللہ کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ الغرض وہ ساری کی ساری تشکلیں قہر کی جو کائنات روح میں بہ شکل خواص و قانون نظر آتی ہے اور حیوانات میں اسکا نام جذبہ غضب تھا۔ وہ سب کی سب خدا کی صفت قہر کے اظلال تھیں۔ نفس مدرکہ کی ابتدائی شکل میں ظلی رنگ میں تھیں۔ لیکن جب قہر انسانی جسم کی حکومت سے الگ ہوگیا تو

تو قہر الٰہی کے رنگ میں رنگین ہوگیا۔ محبت کی بھی یہی صورت ہے۔ خدا کی صفت محبت نے نشاء عالم میں جو پہلی ظلی شکل اختیار کی وہ وہ قانون کشش ہے۔ جو منفی مثبت ذرات برقی کو جوڑتا ہے۔ اور جس کا نام آگے چل کر کشش اتصال و کشش کیمیادی ہو جاتا ہے۔ پھر اس صفت کے ظل میں جذبات شہوات مختلف پیدا ہوئے جس سے حیوانوں میں اور ایسا ہی قلب انسانی میں محبت کی مختلف صورتیں اختیار کیں۔ عشق۔ وداد۔ شغف۔ یہ سب اللہ کی صفت ودود کے اظلال ہیں۔ لیکن جب یہ جذبۂ محبت جسمانی حکومت سے آزاد ہو جاوے اور اس میں نفس کی ملونی نہ رہے تو پھر ظلی لباس کو چھوڑ کر یہ خلق الٰہی کا رنگ اختیار کرلیگا۔ اسی طرح ہر ایک خلق انسانی پر قیاس کرلیا جائے۔ جس وقت سارے کے سارے اخلاق حکومت جسم سے الگ ہو جائیں گے تو یہ اخلاق ربانی بن جائیں گے جس طرح صفات الٰہیہ کائنات کی جان بھی ہیں۔ اور کائنات سے الگ بھی ہیں۔ اسی طرح انسان کے کل کے کل اخلاق یعنی نفس مدرکہ جب جسم میں بمنزلہ جان رہکر جسم سے الگ ہو جائے اس وقت اس کا نام صبغتہ اللہ ہو جائیگا۔

یہ مثال قہر میں نے صرف اس ہی لئے نہیں دی کہ اس سے میرا مقصد جلد سمجھ آ جاتا ہے۔ بلکہ ہر ایک مسلمان اس حالت کو سامنے رکھکر خود غور کرے کہ آیا وہ صبغۃ اللہ ہے یا نہیں۔ جن چند خوارق کو دنیا نے ولایت و کرامت سمجھا ہوا ہے وہ ولایت و کرامت نہیں۔ وہ تو اس ربانی رنگ کے معمولی سے معمولی آثار ہیں۔ ولایت یا تکمیل نفس اسلامی نقطہ خیال سے یہ ہے کہ جن صفات الٰہیہ کے اظلال نے قوانین فطری پیدا کئے۔ اور ہیبولا میں ذرات تنویری و تسویدی کی شکل اختیار کی۔ پھر وہ الیکٹرون سالمات اور عناصر بنے جنمیں سے بعض جمادات اور بعض کی شکل لی جہاں نے عالم تنظیم د
جوہر حیات نے پیدا ہو کر نباتات اور حیوانات کی دنیا پیدا کی اور اس دنیا کا ممتاز سے ممتاز فرد انسان ہے جو اپنی خلقت میں ذرات عالم کی مکمل صورت ہے۔ اس میں کل کے کل ذرات اور ان کی تاثیرات کا نچوڑ آ گیا ہے۔ جنہوں نے قلب انسانی میں رنگ ادراک اختیار کر کے اپنے اندر کل کے کل جذبات حیوانی پیدا کر دیئے۔ جس طرح۔ لوہا

چاندی سونا اور معدنیات ملحیات بامختلف تیزآب زمین میں فلزات کی شکل میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے قلب میں اخلاق فاضلہ اور روحانیات جذبات حیوانیہ کی صورت میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جس طرح مختلف دھاتوں کے فلزات طرح طرح کی تحلیل اور تفرید کے ماتحت پاک صاف ہو کر سونا چاندی لوہا وغیرہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانی قلب کے جذباتی فلزات یعنی حیوانی جذبات مختلف جسم کی تعلیمات مجاہدات اور تجیصات کی تحت میں آکر اخلاق فاضلہ اور روحانیات ہو جاتی ہیں لیکن اگر ایک باریک نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ ہمارے اخلاق فاضلہ اور روحانیات دراصل انہی ارضی فلزات کی ایک اعلیٰ ارفع ارتقائی شکل ہے۔ نطفہ انسانی کو قرآن نے سلالہ طین کہا ہے یعنی کرۂ ارضی میں جو کچھ بھی ہے ان سب کا نچوڑ نطفہ انسانی میں آجاتا ہے یہی زمین کی مختلف دھاتیں اور مختلف نمک و تیزآب عالم نباتات میں مختلف پھل پھول اناج میں جمع ہوتے ہیں یہی چیزیں خوراک بنکر نطفہ انسانی کو پیدا کر دیتی ہیں جس میں جذبات حیوانی مضمر ہوتے ہیں۔ ان کی اصلاح یافتہ یا مہذب و مزکی شکل کا نام اخلاق روحانیات ہے۔

طبیبوں کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ بعض خوراکیں بعض جذبات کی

مولد ہوتی ہیں۔ مثلاً غصے کا مقام اگر جگر ہے۔ تو محبت کی جگہ قلب انسانی ہے بعض چیزیں جگر کے اعتدال کو خراب کردیتی ہیں۔ جس سے انسانی طبیعت میں جذبۂ غضب بھڑک اٹھتا ہے۔ اسی طرح ایسی ادویات یا خوراکیں جو قلب انسانی کی انبساط تفریح کا موجب ہوں۔ وہ ان اخلاق فاضلہ کی بھی آب یاری کرتی ہیں جس سے شرح صدر کو تعلق ہو۔ مثلاً سخاوت۔ شجاعت حلم۔ رواداری شرح صدر کو چاہتی ہیں۔ اور شرح صدر انبساط قلب کو چاہتی ہے۔ اور انبساط قلب۔ مروارید۔ مرجان۔ انگور۔ سیب کستوری۔ ریشم۔ سونا چاندی کے کشتوں کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح استقامت شجاعت کیلئے مضبوطی قلب کی ضرورت ہے۔ اور یہ مضبوطی قلب جسمانی طور سے بھی قوت قلب کو چاہتی ہے۔ اور قوت قلب کسی قسم کے فولادی مرکب سے پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ توکل دہمی باتیں نہیں۔ بلکہ مغربی و مشرقی طب نے ان باتوں پر مہر صداقت لگائی ہے۔ لہذا اگر یہ کہدیا جائے۔ کہ سونا چاندی اور فولاد مختلف شکلیں اور حیثیتیں بدلتے ہوئے مختلف عالموں میں گزرتے ہوئے آخرکار عالم ادراک میں جو شکل اختیار کرتے ہیں۔ اسے سخاوت علم اور استقامت کہتے ہیں۔ تو یہ بات حق الامر ہوگی ؎

وہ لوگ جو نعمائے جنت میں سونا چاندی۔ انگور۔ کھجور۔ انار شہد۔ دودھ۔ ریشم۔ کستوری۔ موتی۔ مرجان وغیرہ کا ذکر پڑھکر معترض بن جاتے ہیں۔ انہیں اول تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ان چیزوں کے نام قرآن میں استعارۃً استعمال ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں اس شکل وہاں نہ ہونگی۔ کیونکہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فرماتے ہیں۔ کہ نعمائے جنت کو نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا۔ نہ ان کی کیفیات کو کسی کان نے سُنا۔ نہ وہ کسی تصور میں آسکتی ہیں۔ اور مذکورہ بالا چیزیں تو ہماری دیکھی بھالی ہیں۔ لہذا آنحضرتؐ کے اس فرمودہ کے مطابق یہ چیزیں اس شکل میں جنت میں تو نہیں ہوسکیں۔ یہ تو استعارہ ہے۔ ہاں یہ سوال ہوسکتا ہے۔ کہ استعارۃً ان چیزوں کو بالخصوص کیوں ترجیح دی گئی۔ سو یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ از روئے تعلیم قرآن جنت کا داخلہ اُسی نفس کیلئے ہے جس کے پہلو میں قلب سلیم ہے۔ بالفاظ دیگر قلب سلیم ہی جنت کا پاس پورٹ ہے۔ دوسری طرف یہ بھی قرآن کریم کی ہی تعلیم ہے کہ قلب کی ایک کیفیت بدیہی دوزخ کا ایندھن ہوجاتی ہے۔ الغرض قلب انسانی ہی جنت اور دوزخ کو پیدا کرتا ہے۔ جو قلب انسانی بہیمیہ یا سبعیہ جذبات کا مسکن بنا رہا۔ اس کے ہر گوشہ میں دوزخ کے ایندھن کے انبار ہونگے۔ لیکن اگر ان جذبات ردیہ نے اخلاق فاضلہ

کی صورت اختیار کرلی یعنی قلب انسانی سلیم ہوگیا۔ تو باغ جنت کے تخم قلب انسانی میں پیدا ہو گئے۔ اگر یہ اخلاق فاضلہ جو حقیقتاً گوشہ جنت ہیں۔ اُن کی پیدایش میں حسب تشریح بالا یہ پھل امداد دیتے ہیں۔ تو اس توشہ بہشت یا نعمائے جنت کا نام اگر استعارتاً انگور۔ انار مرجان وغیرہ رکھ دیا گیا۔ تو یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ اس تشریح کی تائید اس بات سے بھی ہو جاتی ہے۔ کہ جن چند ایک نعمائے جنت کا ذکر قرآن مجید کرتا ہے۔ وہ کل کی کل قلب کی قوت اور اس میں فرحت انبساط بڑھانے کیلئے یہاں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ اب ایک طرف تو بہشت کا داخلہ قلب سلیم پر رکھا گیا۔ اور دوسری طرف نعمائے جنت میں انہی چیزوں کا ذکر ہے جو قلب کے انبساط اور تقویت کا موجب ہوتی ہیں۔ پھر تیسری طرف اس دنیا میں بھی ان چیزوں کا استعمال قلب میں شرح و بسط پیدا کرکے ان اخلاق کے پیدا کرنے کا ممد ہو جاتا ہے۔ جن کے وجود پر قلب انسانی قلب سلیم ہو جاتا ہے تو پھر نعمائے جنت تو دراصل ایک بالغ یا ارتقائی شکل انہی اخلاق کی ہیں ٭

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اسمائے حسنہ یا صفات الٰہیہ کے اظلال مختلفہ نے ہی اس سارے کائنات کی مختلف چیزیں

پیدا کی ہیں۔ اور وہی اشیائے مختلفہ جسم انسانی میں آ جمع ہوئی ہیں۔ جہاں قلب سلیم نے انہیں ان کی آخری شکل میں اخلاق فاضلہ اور روحانیات بنا دیا ہے۔ تو یہ آخری شکل دراصل وہ شکل اول ہے جہاں ابتداء نشاء عالم میں روح خداوندی نے کام شروع کیا یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیے۔ کہ اگر باری تعالےٰ ایک مدرکہ اعظم ہے۔ تو پھر کل کائنات کے مقابل مدرکہ انسانی ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں اس کی کل کیفیات کی کامل جھلک ہے اور اس قابل ہے کہ مختلف ترکیوں کے بعد اس میں خدا تعالےٰ کا رنگ پیدا ہو جائے ؎

سورۂ مومنون کا پہلا رکوع انہیں حقایق کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں انسان کی ابتدا و انتہا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ انسان اپنی پیدائش پر کچھ منازل طے کر آیا ہے۔ اور کچھ منزلیں اس کے سامنے ابھی باقی ہیں۔ اس رکوع نے مختصراً ان تمام منازل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس زمین پر تو انسان کو اس رکوع میں سلالہ طین کہا گیا ہے۔ یعنی زمین کی کل جوہروں کا کشید۔ لیکن یہ رکوع زمین کے اوپر سات آسمانوں یا سات کرۂ افلاک کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جن میں کے ہر مخلوق سے انسان نے حصہ پایا ہے۔ ان سے مراد وہ طبقے ہیں جو زمین کے اوپر ہیں اور زمین سے پہلے پیدا ہوئے۔ ان میں نظام شمسی

کے مختلف اجرام اور دیگر لاتعداد ستارے اور سیارے موجود ہیں۔ یہ سب کے سب اجرام فلکیہ آٹھوں پہر اپنے تاثرات زمین پر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورۃ الطارق کی ابتدائی آیات اس امر کی تصریح کرتی ہیں۔ یہ سورہ بھی دراصل انسانی پیدائش کی ہی تشریح کرتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ النَّجْمُ الثَّاقِبُ یعنی آسمان کو دیکھو اور اس میں ان چیزوں کو دیکھو جو ضرب دینے والی ہیں۔ اور جانتے ہو کہ ضرب دینے والی کیا چیزیں ہیں یہی آسمانی ستارے ہیں جن کی روشنیاں ثاقب ہیں یعنی سخت سے سخت چیز کو بھی چیر پھاڑ کر اس میں سے گزر جاتی ہے۔ اور اشیا میں حل کرتی ہیں۔ لفظ ثاقب کے معنی چمکنے والا بھی ہے۔ اور چیر کر گزر جانے والا اور حل کرنے والا بھی ہے *

پھر آگے چلکر اسی سورہ شریف میں فرمایا۔ وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ یعنی جو جو چیزیں آسمان میں ہیں۔ ان سب میں قوت فاعلی ہے۔ بالمقابل زمین میں قوت قابلہ یا قوت انفعالی ہے۔ ان آیات کا مطلب یہ ہے۔ کہ آسمان میں جس قدر ستارے ہیں۔ ان کے خواص اور اُن کی تاثیریں ان کی روشنی کے ذریعہ زمین میں آجمع ہوتی ہیں۔ اور انہیں سے زمین کے اندر طرح

طرح کی چیزوں کا مواد جمع ہوتا رہتا ہے۔ پھر آسمان سے پانی پیدا ہوتا ہے زمین میں چلا جاتا ہے۔ اور اس مواد کو نباتات کی شکل میں لئے آتا ہے جیسے کہ رکوع مذکورہ بالا کی ذیل کی آیتیں اشارہ کرتی ہیں :۔

ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق	ہم نے تمہارے اوپر سات اور راہ پیدا کئے
وما کنا عن الخلق غفلین ○ و	ہیں راہ کا لفظ بہت معنی خیز ہے یعنی انسان کے
انزلنا من السماء ماءً بقدر	جوہر ان میں سے گزر کر آئے ہیں) اور ہم فعل خلقت
فاسکنٰہ فی الارض وانا علی	سے کبھی غافل نہیں ہوتے پھر ہم مقررہ مقدار میں پانی
ذھاب بہ لقدرون ○	اتارتے ہیں جو زمین میں قایم ہو جاتا ہے۔
فانشانا لکم بہ جنت من	پھر تمہارے لئے کھجور انگور کے باغ پیدا
نخیل واعناب لکم فیھا فواکہ	کر دیتے ہیں اور ایسا ہی کثرت دیگر پھل جو
کثیرۃ ومنھا تاکلون ○ وشجرۃ	تم کھاتے ہو۔ اور وہ درخت بھی پیدا ہوتا ہے
تخرج من طور سیناء تنبت با	یعنی زیتون جو طور سینا میں ہے اس میں
الدھن وصبغ للاکلین (مومنون)	روغن اور سالن ہوتا ہے +

یوں تو زمین کی کل کی کل روئیدگیاں اسی مواد کا نتیجہ ہیں - جو اجرام فلکیہ کی روشنیاں زمین میں لا جمع کرتی ہیں - اور جس کو پانی سورج کی امداد سے زمین کے باہر لاتا ہے لیکن ان آیات نے صرف ان چند چیزوں کا ذکر کیا۔ جو کامل نطفہ انسانی کے پیدا کرنے کیلئے ضروری ہیں۔ انسان

بود یا اس کا نطفہ بر دسے تحقیق جدید سات چیزوں سے تیار ہوتا ہے (۱) مائیات (۲) نشاستہ (۳) حلویات یعنی شکر (۴) دھنیات (۵) لحمیات (۶) نمکیات (۷) فاسفورس - چنانچہ کھجور - انگور اور مختلف پھلوں کا ذکر کرکے شکر اور نشاستہ کا اشارہ کیا - ان میں فاسفورس خاص طور پر زیتون کا ذکر کے دھنیات اور نمکیات کی طرف اشارہ کیا - دودھ کا ذکر کرکے مائیات کی طرف اشارہ ایسے مائع کی طرف اشارہ کیا جس میں دھنیت اور غذویت موجود ہوتی ہے - اور جانوروں کے گوشت کی طرف اشارہ کرکے لحمیات اور فاسفورس کی طرف اشارہ کیا - یہی سات چیزیں زمین مختلف روئیدگیوں اور مختلف جانوروں میں موجود ہوتی ہیں - یہی انسانی خوراک بن کے انسان کے نطفہ کو پیدا کرتی ہیں جس میں بحیثیت سلالہ طین ہونے کے نہ صرف زمین کے ہی کل جوہروں کی ہی کشید ہے - بلکہ حسب منطوق آیات بالا آسمانی اجرام کے خواص بھی آ جمع ہوئے ہیں - اس کے بعد قرآن کریم عالم رحم کا ذکر کرکے ان سات منازل کا ذکر کرتا ہے جس کی پہلی منزل تو نطفہ ہے - اور آخری منزل ادرک حیوانی ہے - چنانچہ فرمایا :-

ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا	پھر ہم نے نطفہ پیدا کیا اور نطفہ سے علقہ
العلقة مضغة فخلقنا المضغة	علقہ سے مضغہ گوشت کا لوتھڑا پھر اس
عظماً فکسونا العظم لحماً ثم	میں ہڈیاں پھر ہڈیوں پر گوشت لگایا - پھر

انشأ نٰه خلقاً اٰخر فتبٰرک اللّٰہ احسن الخالقین ○

سب کے بعد ایک نئی خلقت اس میں پیدا کردی بڑا برکت والا احسن الخالقین ہے

اس آیت میں جسے خلق آخر کہا گیا ہے۔ وہ وہی مدرکہ انسانی ہے جو بروقت پیدائش مدرکہ حیوانی سے ماتا چلتا ہے۔ اس مدرکہ حیوانی کی انسان نے اصلاح کرنی ہے۔ اور اس میں سے اس جوہر کو پاک و صاف کرکے باہر لانا ہے۔ جسے روح خداوندی کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم انسان کے جسم کی ساخت کی ذکر کرتا ہے۔ تو وہاں یہ فرماتا ہے کہ جب انسان کا جسم مکمل ہو گیا۔ تو خدا تعالیٰ نے اس میں اپنی روح پھونک دی یہ روح خداوندی کیا ہے۔ وہی اس کے اسمائے حسنہ یا صفات جو انسانی جامے میں آ جمع ہوتے ہیں۔ اس موقع پر نہایت مختصر سے مختصر انداز پر رکوع زیر بحث ان چند طریقوں کا ذکر کرتا ہے جس سے مدرکہ انسانی اپنی آلائشوں سے پاک ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

قد افلح المومنون ○ الذین ھم فی صلاتہم خاشعون ○ والذین ھم عن اللغو معرضون ○ والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون ○ والذین ھم لفروجہم حٰفظون ۔ الا علیٰ ازواجہم او ما ملکت

مومن ہی دراصل زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں یہ لوگ خدا کے سامنے نماز میں خشوع سے کھڑے ہوتے ہیں۔ لغو سے بچتے ہیں (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں یہ لوگ معاملات زوجیت میں کامل پرہیزگار ہوتے ہیں ....

ایمانہم فانہم غیر ملومین ○ فمن ابتغی ....
وراء ذٰلک فاولٰئک ہم العٰدون ○ ....
الذین ہم لاٰمنتہم وعہدہم راعون ○ امانت اور عہد کے پکے ہوتے ہیں۔
والذین ہم علیٰ صلوٰتہم یحافظون ○ اور نماز پر محافظ ہو جاتے ہیں +

ان صفات سے ہی انسان موت کے بعد آیندہ زندگی میں ابدی نعمتوں کے مالک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

الذین یرثون الفردوس ہم فیہا خالدون ○ یہی لوگ ابدی فردوس کے مالک ہوتے ہیں +

پھر انسان پر موت وارد ہوتی ہے۔ موت کے بعد اس کا پھر حشر ہوگا چنانچہ فرمایا ہے:۔

ثم انکم بعد ذٰلک لمیتون ○

ثم انکم یوم القیٰمۃ تبعثون ○

میں نے یہاں اس رکوع کی کل کی کل آیتیں نقل کر دی ہیں۔ دراصل جو کچھ میں نے اس کل کے کل فصل میں کسیقدر شرح و بسط سے لکھا اس سب کا خلاصہ اس رکوع میں آگیا ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ یہ کل کائنات جو خدا تعالیٰ کے صفات کا مظہر ہے۔ وہ انسان میں آجمع ہوئی ہے اور اس طرح انسان مظہر صفات باری ہو جاتا ہے۔ ان آیات کو پڑھکر

ایک نیک طبیعت انسان اگر تھوڑے سے انصاف سے بھی کام لے۔ تو مجبوراً اس نتیجہ پر آجائے گا۔ کہ قرآن انسانی کلام نہیں۔ آج علوم جدیدہ کی روشنی میں انسان پر جن حقایق کا انکشاف ہوا ہے۔ اور یہ انکشافات گزشتہ سو سال کے اندر ہی اندر پیدا ہوئے ہیں۔ وہ کس طرح شارع اسلام کے دماغ میں آسکتے ہیں۔ اگر قرآن خدا کا کلام نہیں۔ آج ہی انسان کو علمی دنیا نے عالم صغیر تسلیم کیا ہے۔ آج ہی یہ امر تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ کل کے کل ستارے زمین کی روئیدگیاں پیدا کرنے میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ بھی آج کی ہی تحقیق ہے کہ انسان کا جسم یا نطفہ اپنی تکمیل کیلئے سات اجزا کا محتاج ہے یعنی نباتات چکنائی۔ شکر۔ گوشت و پروٹیڈ۔ نمکیات۔ نشاستہ۔ اور مادہ استخوان یہ بھی جدید سائنس نے ہی دریافت کیا ہے۔ کہ عالم رحم میں نطفہ سات منازل مندرجہ قرآن طے کرتا ہے۔ یہ سب کی سب باتیں قرآن کریم نے اس ایک رکوع میں جمع کردیں۔ پھر کوئی مبہم الفاظ استعمال نہیں کئے۔ بلکہ صاف صاف الفاظ میں ان حقایق کی تشریح کردی۔ اگر قرآن خدا کا کلام نہیں۔ تو پھر یہ علوم پیش از وقت انسانی دماغ میں کیسے پیدا ہوئے؟

سیر افکار

تکمیل نفس کے منازل مختلفہ

الحمد لله رب العلمین

قرآن کریم آیت الحمد للہ رب العلمین سے شروع ہوتا ہے۔ لفظ رب کے معنی نہ صرف۔ خالق۔ رازق اور قیوم کے ہی ہیں۔ بلکہ یہ لفظ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جس پر اس زمانہ کے مسئلہ ریولیوشن (مسئلہ ارتقا) نے روشنی ڈالی ہے۔ ہر ایک چیز میں طرح طرح کے جوہر مضمر ہوتے ہیں۔ وہ ایک ہی وقت یا ایک ہی حالت میں ظاہر نہیں ہوتے۔ بلکہ ہر چیز مختلف حالتوں میں سے گزرتی ہوئی آہستہ آہستہ اپنے جوہروں کو ظاہر کرتی جاتی ہے اور آخر کار اس چیز کے کل جوہروں کا خلاصہ اسکے آخری حالت پر پہنچنے سے ظاہر ہو جاتا ہے وہی اصل اس چیز کی پیدایش کی علت غائی ہوتی ہے ایک پھل دار درخت کو ہی دیکھ لو اسکے پیدایش کی علت غائی تو اسکے وہ جوہر و خواص ہیں جو اسکے پھل میں آ کر ظاہر ہوتے ہیں لیکن وہ سب کے سب استعداداً اس کے تخم میں ہی موجود ہوتے ہیں۔ یہ تخم زمین میں ڈالا جاتا ہے۔ پھر اس میں سے ایک کونپل نکلتی ہے۔ کونپل سے ایک مضبوط تنا بن جاتی ہے جس میں سے شاخیں پھر شاخوں میں

پتے پھر پتوں میں سے پھول اور پھول میں سے پھل اور پھر پھل میں اس چیز کے جوہر و خواص مختلف آ پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر ایک چیز کے تخم کو اپنے خواص مختصہ کے ظہور تک پہنچنے کے لئے سات عالموں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہر ایک عالم کی کیفیت ایک دوسرے سے جداگانہ ہے۔ اور اُس کی تربیت کے سامان بھی لامحالہ جداگانہ ہی ہوتی ہیں لیکن ہر عالم میں وہ اسباب پہلے سے ہی مہیا ہوتے ہیں۔ اس لیے ذات باری کا نام رب العلمین ہے لفظ رب اور لفظ عالمین گویا کل کائنات کی حقیقت کو ہمارے سامنے لے آتے ہیں۔ لفظ رب اپنے معنوں کی رو سے جیسے کہ امام راغب نے مفردات قرآنی میں لکھا ہے اور ایسا ہی تاج العروس میں بھی لکھا ہے۔ وہ ہستی ہے جو پہلے چیزوں میں بعض استعدادیں رکھ دے۔ پھر ان استعدادوں کو بتدریج حد کمال تک پہنچا دے۔ اور اس غرض کیلئے جن جن مدارج یا عالموں میں سے وہ چیزیں ہو کر گزریں۔ وہاں ان کی تربیت کا سامان بھی مہیا کردے۔ ایسی ہستی کو رب کہتے ہیں۔ اور چونکہ ہر ایک چیز کمال تک پہنچنے کے لئے مختلف عالموں میں سے ہو کر گزرتی ہے اس لئے وہ ہستی رب العلمین کہلائی ٭

انسان اس عالم زمین پر آنے سے پہلے کئی عالموں میں سے ہو گزرا ہے

اور ہر عالم میں خدا تعالیٰ نے اُس کی ربوبیت کیلئے اُسے صحیح راہ پر چلایا لیکن منزل آخری تک ابھی بہت سے عالم اُس کے آگے ہیں۔ جن میں محتاج ہدایت ہے لیکن جن عالموں میں اس نے آیندہ گزرنا ہے۔ انکا تعلق زیادہ تر جسم سے نہیں۔ بلکہ ادراک سے ہے۔ اور اُس کی آیندہ کی تربیت بھی دراصل اس کے ادراک کی ہی تربیت ہے۔ جس کیلئے اگر وہ کسی ہدایت کا محتاج ہے تو اُس ہدایت کا رنگ بھی ایسا ہونا چاہیئے جو ذہنیات سے تعلق رکھے۔ اس لئے قرآن کریم کو جو اس آیت سے شروع کیا گیا۔ تو اس میں قرآن کریم کے نزول اور اُس کے متلو ہونے کی ضرورت ظاہر کر دی گئی یعنی قرآن کریم ان ہدایات کو لایا ہے جن کے ماتحت انسان کی آیندہ عالموں میں تربیت ہونی ہے۔ گویا اللہ تعالےٰ کا رب العلمین ہونا ہی اس امر کا متقاضی ہے۔ کہ رب انسان کی ربوبیت کے سامان اس زمینی عالم میں حسب ضرورت پیدا کئے جائیں۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ ان اسباب کو مہیا کرے جو انسان کو آیندہ عالموں میں جو ذہن اور ادراک سے تعلق رکھتے ہیں گزرنے اور وہاں کے متعلقہ جو ہر انی انہیں پیدا کرنے کیلئے امداد دیں۔ الہام کی ضرورت پر یہی امر ایک مضبوط دلیل ہے۔ جب جسم کی تربیت کیلئے کل کے کل سامان کائنات میں خدا تعالیٰ نے جسمی رنگ میں پیدا کر رکھے ہیں تو

پھر ادراک کی پرورش اور ترقی کیلئے کیوں کوئی ذہنی اور ادراکی چیز خدا تعالےٰ کی طرف سے نہ آئے یعنی اب ہدایت ملفوظ رنگ میں قرآن کریم کے اشارات سے نظر آتا ہے۔ کہ ہر ایک چیز کے سامنے ایک لمبا سفر ہے۔ وہ اپنے کمال تک پہنچنے کیلئے مختلف عالموں میں سے گزرتی ہے لیکن ہر ایک عالم میں پھر چھوٹے چھوٹے سات منازل اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ ہر عالم میں اس چیز کی ابتدائی حالت میں کل چھ حالتیں استعداداً موجود ہوتی ہیں۔ ساتویں حالت میں وہ چیز کامل ہوکر پھر اگلے عالم میں از سرِ نو ترقی کرنے کے لئے جا داخل ہوتی ہے۔ ہر عالم میں ہر چیز کی پہلی حالت کا نام عربی زبان میں بلغہ رکھا گیا ہے یعنی کسی چیز کی وہ حالت جس میں اس کی کل کی کل استعدادیں بغرض نشو و نما موجود ہوتی ہیں پھر وہ استعدادیں جب ظہور میں آئیں۔ تو اس حالت کا نام حالت بلوغت ہوتا ہے۔ ثمردار درخت کا تخم اس کی حالت بلغہ ہے اور جب ثمر پختگی کو پہنچتا ہے۔ تو وہ اس کی حالت بلوغت ہوتی ہے قرآن کریم کی تعلیم سے یہ بھی نظر آتا ہے۔ کہ جب کسی عالم میں ایک بلغہ اپنی بلوغت کو پہنچ جائے۔ تو بلوغت یافتہ حالت آئندہ عالم میں از سرِ نو پھر بلغہ ہو جاتی ہے اور پھر اس کے آگے سات اور منزلیں اس نئے عالم کی بلوغت کی ہوتی ہیں پچھلی فصل میں ہم نے انسان کی پیدائش

کا ذکر کرتے ہوئے نطفہ انسانی کا ذکر کیا ہے جسم انسانی کل ارضی چیزوں کی کشید ہوتی ہے اور اس کشید سے نطفہ تیار ہوتا ہے جسے قرآن کریم نے سلالہ طین کہا ہے۔ اور سلالہ طین جسم انسانی کا بلغہ ہے جو بصورت نطفہ اس کی دوسری منزل ہے۔ رحم میں جاکر اور پانچ منزلیں طے کرتا ہوا۔ ساتویں منزل پر اس حالت کو پیدا کرتا ہے جسے قرآن کریم نے خلقاً آخر کہ کے پکارا ہے وہ سات حالتیں یہ ہیں۔ سلالہ نطفہ۔ علقہ۔ مضغہ۔ استخوان۔ گوشت خلق جدید یعنی مدرکہ۔ الغرض ہر ایک عالم میں کسی چیز کی آخری منزل پر ایک نئی چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ نئی چیز پرانے عالم کی۔ بالغ حالتوں کو تو اپنے ساتھ نئے عالم میں لے آتی ہے۔ کیونکہ اس کی زیست ان حالتوں کے قیام پر ہی منحصر ہوتی ہے لیکن جس چیز نے آیندہ ترقی کرنی ہوتی ہے۔ وہ وہ چیز ہے جس کا ظہور گذشتہ عالم کی ساتویں منزل پر ہوتا ہے۔ انسان رحم میں ہی جسم کی کل ترقی کے سامان پیدا کر لیتا ہے۔ اور رحم سے باہر تھوڑے عرصہ میں جسم کی تکمیل بھی کر لیتا ہے۔ اور حق الامر بھی یہی ہے کہ اس زمین پر جسم کی ترقی صرف ہیولے جسم انسانی میں کمال تک پہنچ جائے جمادات۔ نباتات۔ حیوانات کی اقسام مختلفہ سب کی سب جسم کی مختلف بلوغت یافتہ شکلیں تو ہیں لیکن جسم اگر اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ تو یہ امر انسان کی شکل

میں آکر ہوتا ہے۔ گویا جسم کی ترقی کامل طور پر انسان کی شکل میں ہو جاتی ہے اس سے آگے جسم کی ترقی کی کوئی گنجایش نہیں۔ اب اس آخری ترقی پر جو نئی چیز پیدا ہوتی ہے۔ وہ انسان کا نفس مدرکہ ہے۔ جو رحم میں ہی پیدا ہو جاتا ہے یہی نئی خلقت عالم ادراک کا بلغہ ہوتی ہے یعنی جس نے آگے ترقی کرنی ہے۔ لہذا انسان اس دنیا میں جسم کی خدمت کیلئے نہیں اس کی آیندہ ترقی تو اسکے ادراک کی ترقی ہے +

مدرکہ انسانی کی ابتدائی کیفیت مدرکہ حیوانی سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں نفس امارہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے میں نے ابھی ذکر کیا ہے کہ ہر عالم میں ایک چیز بلوغت کے سات منازل کو طے کرتی ہے اور ساتویں منزل پر جا کر اس عالم کی متعلقہ ترقی کو حاصل کر لیتی ہے اسیطرح انسان کے مدرکہ نے بھی نفس امارہ سے چلکر ساتویں منزل پر تکمیل پائی ہے۔ ان سات منزلوں کے نام قرآن کریم نے حسب ذیل تجویز کیے ہیں۔ نفس امارہ۔ نفس لوامہ۔ نفس ملہمہ۔ نفس مطمئنہ۔ نفس راضیہ۔ نفس مرضیہ۔ نفس کاملہ

قرآن کریم نے ہر ایک نفس کے خط و خال بھی بیان کئے۔ اور پھر ہر ایک منزل پر اس منزل کی تربیت کے سامان بھی تجویز کئے لیکن پیشتر از یں کہ ہم ان امور پر زیادہ لکھیں۔ اس جگہ ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ اس چیز پر روشنی ڈال دیں جس کو عامۃ الناس کی اصطلاح میں روح کہتے ہیں۔ اردو

تعلیم قرآن روح جسم سے الگ نہیں۔ نہ کوئی فالتو چیز ہے۔ نہ کسی
اور عالم سے آکر جسم میں ملی ہے۔ روح جسم میں سے نکلتی ہے۔ ہاں یہ
کہہ سکتے ہیں کہ اصل جوہر کائنات جو روح خدائی کا پہلا عکس وظل ہے اور جو
دن بدن مختلف حجابوں میں مستور ہوتا ہوا زمین میں آجاتا ہے جہاں یہ حجابوں
سے پھر الگ ہونا شروع ہوتا ہے وہ آخرکار جسم انسانی میں آکر اس حالت
کے قریب ہوجاتا ہے جیسے اس کی ابتدائی صورت تھی یعنی جسم
انسانی میں وہ چیز پیدا ہوتی ہے جو روح خداوندی کے بہت اقرب ہے
یا یہ کہو کہ روح خداوندی یہاں آکر بہت سے حجابوں سے باہر ہوجاتی
ہے اور اپنی اصل شکل کے قریب آجاتی ہے۔ روحوں کا الست کے
دن رونا اسی حقیقت کا اظہار ہے جسم انسان میں اس روح ازلی کی
پہلی شکل جو ہے وہ ادراک انسانی ہے جسے قرآن نے "خلق آخر" کہا جو جسم
میں سے نکلتا ہے یہی مدرکہ اپنی کسی بالغ حالت میں وہ کیفیت اپنے اندر
پیدا کر لیتا ہے جس سے اس کا نام عامہ اصطلاح میں روح ہوجاتا ہے
قرآن نے مدرکہ کا نام نفس بھی رکھا ہے۔ نفس کے معنی کسی چیز کی اصلیت
یا جوہر کے ہیں۔ کسی چیز کی ان صفات خاصہ کو نفس کہا جا سکتا ہے
کہ جن کے ہونے سے ہی وہ چیز اپنا خاص نام پاتی ہے۔ دراصل اسی کے
ظہور تام کے بعد وہ چیز مخلوق ہوتی ہے۔ اب اگر انسان کی کسی چیز کا

نام روح ہے۔ تو وہ انسان کی ہر حالت میں اس میں موجود ہونی چاہئے وہی مختلف منازل طے کرتی ہوئی آخرکار اس منزل کو بھی پہنچ جاتی ہے اور اس میں وہ خواص بھی پیدا ہو جاتے ہیں جس کے رو سے اُسے اس عامہ اصطلاح میں روح کہتے ہیں۔ روح دراصل نفس انسانی کی ایک بالغ کیفیت کا نام ہے لیکن وہ اس شکل میں بھی موجود ہوتی ہے۔ جسے نفس امارہ کہتے ہیں۔ ہاں جس چیز کا نام عام اصطلاح میں روح ہوتا ہے یعنی نفس انسانی کی وہ حالت جب اس کے کل جذبات نفس ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ اور نفسانی خواہشات تہذیب و تعدیل پالیتی ہیں۔ انسان اس حالت میں اضطراراً نیکیوں کی طرف جھکتا ہے۔ اور بدیوں سے رک جاتا ہے۔ وہ دنیا کی لذات سے اسی قدر حصہ لیتا ہے جو جسم میں بقائے روح کیلئے ضروری ہو۔ اور باقی چیزوں سے کوئی تعلق اسے نہیں ہوتا۔ اگر ایسی حالت کا نام روح ہے۔ جیسے عام لوگ سمجھے ہوئے ہیں۔ تو یہ نفس انسانی کی بلوغت کی چوتھی حالت ہے جسے قرآن نے نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے۔ اور ابھی تو اس کے آگے تین منزلیں اور ہیں جن کے خاتمے پر نفس انسانی کامل ہو کر انسان کو مسجود ملائکہ بنا دیتا ہے یہی وہ مقام ہے۔ جہاں نفخت فیہ من روحی کے منطوق کا صحیح نقشہ ظاہر ہونے لگتا ہے جیسے قرآن کریم نے فرمایا

فاذا سویتہ ونفخت من روحی فقعوا لہ ساجدین قصہ آدم ودرصل انسانی ترقیات کا اور اس کے تنزل کا ایک نقشہ ہے۔ جو ہر ایک انسان کے سامنے موجود ہے سویتہ سے مراد تکمیل جسمانی ہے یعنی روح خداوندی اس وقت انسان کے جسم میں اپنی ابتدائی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جب جسم ہر صورت میں مکمل ہوجاتا ہے اور جب روح اپنا کامل جلوہ دکھانے لگتی ہے تو ملکوت السماوات والارض اس روح کے آگے جھکتے ہیں اگر قرآن نے تہذیب و تکمیل نفس کی ابتدائی تعلیمات میں جسمانیات پر زور دیا اور کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق ہدایات فرمائیں۔ تو وہ بھی اسی آیت کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک صالح جسم میں ہی ادراکی اور روحانی ترقیات ہوسکتی ہیں یہی وہ مقام ہے جہاں کمالات نفس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچکر انسانی دائرے کی بلند سے بلند قوس دائرہ الوہیت کی نچلی قوس سے جاملاس کرتی ہے۔ صوفیائے کرام نے اس حقیقت کو حقیقت محمدیہ سے تعبیر کیا ہے قاب قوسین میں جن دو قوسوں کا ذکر ہے۔ وہ یہی انسانی اور ربانی دائروں کی قوسین ہیں اس مقام پر پہنچکر قلب انسانی کل جذبات سے پاک ہوکر تخت الوہیت بن جاتا ہے۔ انسان خدا کے اخلاق سے متخلق ہوکر صبغت اللہ میں رنگین ہوجاتا ہے۔ کرامت معجزے

اس ... کے ہمقرین ہوتے ہیں"۔

یہاں ہم بہ رعایت اختصار مندرجہ بالا منازل نفس کی کچھ کیفیت بھی بیان کردیتے ہیں۔ ان سب منازل میں سے سب سے زیادہ خطرناک اور سب سے زیادہ مشکل منزل مقام امارہ ہے جو نسل انسانی کے بہت سے حصے کو آگے جانے سے روک لیتا ہے۔ اور مجھے تو اس منزل میں اس وقت کل کی کل دنیا پھنسی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ دنیا پر تمدنی اور اقتصادی اثر اس قوم کا ہے جن کا مذہب ہی یہ تعلیم کرتا ہے کہ انسان اپنی سعی سے نفس امارہ کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یعنی مذہب کلیسہ جیسے کہ میں آگے چل کر بتلاؤں گا۔ یہ منزل وہی منزل ہے جب حیوانی جذبات جوش و خروش میں ہوتے ہیں۔ اس وقت نفس ہر ایک روی خواہش کے پورا کرنے کیلئے انسان پر جابرانہ حکومت کرتا ہے اسی لئے اس کا نام قرآن نے نفس امارہ رکھا ہے یعنی بہت حکومت کرنے والا۔ نیکی بدی کی اُسے تمیز نہیں ہوتی۔ کسی طرح سے ہو۔ یہ اپنی خواہشیں پوری کراکر رہتا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے فرمایا ان النفس لامارۃ بالسوء۔ خواہشات نفس یا طبعی تقاضے بالاصل تو بری چیز نہیں ہوتے۔ یہی تقاضے تو ہر قسم کے علم و عمل کا موجب اور محرک ہوتے ہیں۔ تمدن و تہذیب نے آج جو کچھ پیدا کر رکھا ہے اسکی تہ میں یہی تقاضے

نفس مضمر ہیں۔ انسان کی دستکاری وصنعت اور سائنس کے آئے دن
کرشمے ان سب کو یہی ہماری جبلی اشتہائیں وجود میں لے آتی ہیں۔ کہتے
ہیں۔ کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے لیکن ضرورت انسانی کا سرچشمہ
یہی ہمارے طبعی تقاضے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہی طبعی تقاضے
ہر قسم کے جرائم کے بھی ذمہ دار ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ ہمارے تقاضے
جب ہمیں اسباب دفع تقاضاء کے حصول پر مجبور کرتے ہیں تو اگر اس غرض
کیلئے ہم نے اپنے دل ودماغ کو اور خداداد قوتوں کو صحیح اور مناسب طریق
پر استعمال کیا۔ تو دنیا اعلیٰ درجہ کی متمدن زندگی دیکھ لیتی ہے لیکن اگر حصول
اسباب مذکورہ بالا کیلئے انسان نے محنت سے دل چرایا۔ اور اپنی ضرورت کے
پورا کرنے کیلئے اس نے دوسروں کے مکسوبات پر نگاہ رکھی اور ناجائز
طریق سے اُن پر قبضہ کرنا چاہا تو دنیا کا تمدن تباہ ہو جاتا ہے۔ اور بدی
اور جرائم پھیلنے لگتے ہیں کسی سے کوئی چیز خریدنا یا چیز مذکورہ کو اُس سے
چرالینا بیشک دو مختلف ومتضاد چیزیں ہیں لیکن ان کا نتیجہ ایک ہے۔ یعنی
صرف اسباب حصول نتیجہ نے ان میں فرق پیدا کر دیا ہے۔ دونوں حالتوں
میں وہ چیز ایک کے قبضے سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں چلی آئی ہے لیکن
ایک صحیح طریق پر دوسری مذموم طریق پر۔ وہ انتقال قبضہ تو ہر حالت میں واقع
ہوا ہے۔ اور اگر اعلیٰ تمدن کی کل مسئلہ بیع وشری سے ہی چلتی ہے۔ تو بیع شری

میں انتقال قبضہ کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ لہذا طبعی تقاضوں یا فطری جذبات کو مارنا نہ صرف ایک غیر طبعی امر - - اور اللہ تعالیٰ کے فعل پر نکتہ چینی کرنا ہے۔ بلکہ ان کے صحیح استعمال سے جو مفاد دنیا کو حاصل ہوتے ہیں۔ انکا بھی استیصال ہوجاتا ہے۔ تمدن و تہذیب کی سب راہیں بند ہوجاتی ہیں جذبات کو مارنے کی تعلیم قریب قریب کل قدیمی مذاہب نے دی صرف اسلام نے ہی دنیا کو اس کی تعدیل و تہذیب کی طرف متوجہ کیا یہی وجہ ہے کہ عیسوی مذہب کی یہ رہبانی صورت یورپ میں کئی صدیوں تک حکومت کرتی رہی پھر چودھویں پندرھویں صدی تک کونسا تمدن وہاں تھا۔ بلکہ یورپ نے اسی وقت ترقی کی صورت دیکھی جب کلیسیہ کی اس تعلیم سے اپنے آپ کو آزاد کیا۔ ہمارے جذبات نہ تو فی نفسہٖ ردی ہیں اور نہ ادنے۔ ہمارا اپنا فعل اور ارادہ ہی ان کو ردی یا ادنے بنا دیتا ہے ان جذبات کا نام جذبات حیوانیہ رکھنا ان معنوں میں تو صحیح ہے۔ کہ یہ جذبات ہم میں اور حیوانوں میں مشترک ہوتے ہیں لیکن اور بھی بہت سی باتیں ہم میں اور حیوانوں میں مشترک ہوتی ہیں۔ یہ اشتراک تو ہمیں ان جیسا نہیں بنا دیتا۔ ہاں جب ان جذبات کی تسکین کے لئے ہم وہ راہ اختیار کریں جو حیوان اختیار کرتے ہیں۔ تو یہ تو ہمارا اپنا فعل ہے کہ جو ان جذبات کو جذبات حیوانی بناتا ہے۔

دنیا میں کوئی بھی چیز بذات خود بری نہیں۔ خدا کی طرف سے جو چیز آئی

وہ خیر محض ہے قرآن نے یہی تعلیم کی ہے۔ آگ کو رحمت یا لعنت بنا لینا
انسان کے اپنے فعل کا نتیجہ ہے۔ آگ کا اس میں کیا قصور ہے۔ اس سے
خواہ کسی کا گھر پھونک دو۔ یا اس سے کھانا پکا لو۔ ان جذبات شہویہ کے
علاوہ جو دراصل عیسائی مذہب کی ان راہبانہ تعلیمات کا موجب ہوئے
ہمارے اور بہت سے علمی۔ عملی۔ ادراکی۔ ذوقی جذبات بھی ہیں وہ
سب اپنے کسی رنگ میں ہمارے لئے لعنت ہو سکتے ہیں لیکن دراصل
وہ رحمت ہی رحمت ہیں وہ کسی مقصد اعلیٰ کیلئے ہماری طبیعت میں رکھے
گئے ہیں۔ مثلاً انسان طبعاً چاہتا ہے۔ کہ لوگ اسے اچھی نگاہوں سے
دیکھیں۔ اور تو اور انسان خود اپنی نگاہ میں اپنے آپکو اچھا دیکھنا چاہتا ہے
اسے اپنی ہر ایک بات محبوب نظر آتی ہے۔ آئینہ کے سامنے کھڑے
ہو کر ایک بدصورت سے بدصورت آدمی بھی اپنے چہرہ میں کوئی نہ کوئی خوبصورتی
دیکھ لیتا ہے۔ یہ جذبہ جو خودداری یا خودغرضی جیسے شریف تقاضا کی روح رواں ہے
انسان میں اس لئے رکھا گیا کہ وہ اعمال حسنہ اور کسب کمال کیطرف متوجہ
ہو اور اس طرح اپنے آپکو دوسروں کی نگاہ میں عزیز ممدوح اور قابل تعریف
بنائے جس سے اس کا وجود اس کیلئے اور دوسروں کیلئے باعث رحمت
ہو جائے۔ لیکن یہی وہ تقاضا ہے جو انسان کو خودبین خودنما اور خودپسند بنا دیتا
ہے جس پر وہ ہر قسم کے اکتسابات کمال سے رک جاتا ہے یہی خودپسندی اور خودنمائی

اُس میں عیب بینی پیدا کر دیتی ہی۔ نکتہ چینی کا جذبہ بھی مذکورہ بالا جذبہ کی طرح ایک عمدہ مقصد کیلئے ہی فطرت انسانی میں رکھا گیا تھا۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ انسان ایک طرف تو اپنے عیبوں کو بغرض اصلاح دیکھے کیونکہ اپنے عیب سے ناواقف رہنا انسان کو مدارج عالیہ کے حصول سے روک لیتا ہی۔ دوسری طرف چونکہ جذبہ خود عزتی کا غلط استعمال یا اسکی کریہہ شکل یعنی خودبینی انسان کو اپنے عیوب سے ناواقف رکھتی ہی۔ اس لئے ہماری اصلاح اسی طرح ہو سکتی تھی۔ کہ کوئی دوسرا ہمیں ہمارے عیب سے اطلاع دے لیکن ان جذبات کا صحیح استعمال اعلیٰ درجہ کی حکمت و فطنت اور پاکیزگی نفس چاہتا ہی۔ اس پر ایک نہایت ہی لطیف بحث حضرت امام غزالی رح نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں فرمائی ہے۔

علی العموم یہ دونوں جذبے بد استعمالی میں آکر انسان کو عیب چین اور معائب شمار بنا دیتے ہیں نیک نگاہ سے دوسروں کے عیب دیکھکر انہیں بغرض اصلاح اطلاع دینا تو انسانوں کو اعلیٰ درجہ کے اخلاقوں سے آراستہ کر سکتا ہی لیکن یہی باتیں انسانوں میں زیادہ تر فساد اور تکلیف کا موجب ہو رہی ہیں مثلاً ہنسی مذاق کا جذبہ۔ اسکا استعمال اُسی حد تک جائز ہی جس حد تک کھانے میں نمک ہوتا ہی جذبہ مذاق تو اسلئے پیدا ہوا کہ ہموم و غموم کے وقت انسان کے اندر خوش مزاجی پیدا کر دے۔ اور انسانوں کو بہت افسردگی سے بچائے۔ جو ہم میں آٹھوں پہر کی سنجیدہ مزاجی پیدا کر دیتی ہی۔ لیکن یہی جذبہ مذاق حدود اعتدال سے

باہر ہو کر انسان کو پرلے درجے کا خودبین اور دوسرونکا عیب جو بنا دیتا ہے مذاق کی بدنما شکل کسی دوسرے کو الو بنانا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ سننے والے یا دیکھنے والے دوسروں پر نہیں کسی کا مذاق اُڑانا دراصل اسکی کمزوری کی طرف دوسرونکو متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ کمزوریاں ہی دراصل کہیں غصے اور کہیں ہنسی کا موجب ہوتی ہیں تمسخر کرنیوالے کی نگاہ ہمیشہ دوسرونکے عیب اور کمزوری پر ہوتی ہے۔ اس سے نہ صرف اس میں عیب شماری اور نکتہ چینی ہی آجاتی ہے۔ بلکہ اس کے اپنے عیب اسکی آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں۔ اور وہ خودنما خودپسند اور خودبین ہو جاتا ہے اور اگر ایسا انسان اپنی زندگی میں اتفاقاً کسی کامیابی کا منہ بھی دیکھ لے۔ تو اس میں نخوت غرور اور خودآرائی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے ان سارے عیوب کو ایک ہی جگہ اسی لئے جمع کر دیا۔ کہ یہ سب ایک دوسرے کے موید اور مواد ہوتے ہیں۔

میں نے جو ان چند جذبات پر یہ چند سطریں لکھدیں۔ اس سے میری غرض اسی قدر تھی کہ ہمارے جذبات شہویہ ہی نہیں بلکہ ہمارے کل کے کل جذبات اپنی طبعی شکل میں ایک ہی رنگ کے ہوتے ہیں۔ یہ سب کے سب مکروہ یا اعلےٰ خوبیاں بن سکتے ہیں۔ یہ جذبات ہمیں اس لئے نہیں دئے گئے کہ ہم ان کے تقاضوں کو بغیر کسی سوچ سمجھ کے پورا کریں۔ یہ جذبات تو جیسے کہ میں دوسری جگہ لکھا۔ مختلف دھاتوں کے فلزات کی طرح ہمارے اندر رکھے گئے ہیں۔

جسطرح ان فلزات سے ہی سونا چاندی اور دوسری قیمتی دھاتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک وقت یہی طبعی جذبات اعلیٰ اخلاق اور روحانیات ہیں۔ آخر سونے کے فلزات بھی تو کئی قسم کے منازل میں سے گزر کر طلائے خالص کی شکل تک پہنچتے ہیں۔ ایسیطرح طبعی جذبات جنکی پہلی شکل کا نام نفس امارہ ہو مختلف ریاضتوں کے بعد ہی محمود شکل اختیار کرتے ہیں پھر کونسی عجیب بات ہے اگر ان جذبات کی صورت امارہ زیادہ بدنما نظر آتی ہو۔ سونا اپنی ابتدائی شکل میں بھی تو آخر کنکروں کی ہی شکل میں ہوتا ہو۔ اس وقت اسکی کیا قیمت ہوتی ہو جو ہم اخلاق امارہ سے گھبرا اٹھیں جس طرح سونے کی معدنی شکل ایک نا اہل کے ہاتھ میں زدوکوب کا آلہ بن جاتی ہے۔ اسیطرح ہمارے جذبات کی ابتدائی شکل اگر دنیا میں فساد پیدا کردے۔ تو یہ ایک لازمی امر ہے +

میں نے اسبات پر یہاں اس لئے زور دیا۔ کہ اسلام سے پہلے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب نے نفس امارہ کی کریہہ صورت کو دیکھکر اپنے آپکو یا یوسی کا تختہ مشق بنالیا اور اپنے مذاہب کو ایسی غلط بنیاد پر رکھا۔ کہ جس سے نہ صرف اخلاق کی ہی تباہی ہوئی بلکہ انسانیت کے متعلق بھی بہت بری رائے رکھی گئی۔ مثلاً عیسائی مذہب کو ہی دیکھ لو۔ اس کا بنیادی پتھر یہ ہے۔ کہ انسان میں کوئی خیر و خوبی نہیں۔ اسکی جبلت میں بدی ہو۔ انسان مجسمہ گناہ ہو اور وہ اپنی کوشش سے کسی خیر و خوبی کو حاصل نہیں کرسکتا چنانچہ حسب عقیدہ کلیسیہ خدا نے کسی اَمر

برس تک انسان کو اصلاح کا موقع دیا۔ اس کیلئے وقتاً فوقتاً قوانین وشریعت بھیجے آخر ہزارہا برس کے اس تجربہ سے مایوس ہو کر خدا تعالیٰ کو کفارہ کا نسخہ سوجھا کہ شائد کفارہ ہی انسان کی فطرت میں کوئی اعجازی تبدیلی پیدا کر دیتا۔ مگر عیسائی دنیا کے زیادہ حصے نے یہی ثابت کیا۔ کہ یہ آخری نسخہ بھی بیسود ہی ہے۔ دنیا میں کلیسیے مذہب نے جو جو فساد اور جرائم کئے۔ اس سے بڑھکر تاریک منظر کہیں اور نظر نہیں آتا جن کی تفصیل سے مجھے اس کتاب کے صفحات کا موضوع روک رہا ہے میں یہاں اسی قدر لکھنا چاہتا ہوں۔ کہ ایک طرف تو وہ مذہب ہے یعنی اسلام جس نے انسان کی ترقی کے کئی منازل ہمارے سامنے رکھے۔ کہاں نفس امارہ اور اسکی طبعی بد عنوانیاں اور کہاں نفس انسانی کو امارہ کی بدعنوانیوں سے نکالکر دوسری منزل پر ہی ان بدعنوانیوں سے متنفر کر دینا۔ اس حالت کا نام قرآن نے نفس لوامہ رکھا ہے۔ پھر یہ مرحلہ نفس ہی ہمارے راہ کی آخری منزل نہیں ہمیں تو ابھی پانچ اور منزلیں آگے جانا ہے یعنی تیسری منزل میں ہیں اس مقام عالی پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں ہم پر تقویٰ اور فسق و فجور کی راہیں خود بخود منکشف ہو جائیں یعنی وہ نابینائی جو نفس امارہ کی سرجوشیوں میں ہم پر آسوار ہوتی ہے یہ تیسری منزل پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہاں ہم نیکی بدی کی کامل نصرت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور بدی کے مہلک ہونے پر ہمارا ایسا ہی ایمان ہو۔ جیسے کہ ہم سنکھیا کے مہلک ہونے پر ایمان رکھتے ہیں تو ممکن نہیں۔ کہ ہم گناہ کے نزدیک جائیں۔ اس قسم کے ادراک کی اہلیت

تو ہمارے نفس میں اول ہی استعداداً موجود تھی لیکن وہ کونسی ہماری اعلیٰ استعداد ہے جو پہلی منزل میں ہی بالغ ہو جاتی ہے۔ امارگی کی حالت میں نفس بظاہر اندھا ہوتا ہے لیکن تیسری منزل پر جا کر جس کا نام قرآن نے نفس ملہمہ رکھا ہے انسان میں بدی نیکی کی حقیقی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے اس بصیرت کے پیدا ہوتے ہی انسان میں کامل اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ بطیب خاطر نیکی کے راستے پر قدمزن ہوتا ہے اور بدیوں سے اضطراراً بچتا ہے۔

یہ ہماری ترقی کی چوتھی منزل ہے۔ جسے قرآن نفس مطمئنہ کہتا ہے۔ اس مقام کے کامل ہونے پر انسان رضا بالقضا کا مسلک اختیار کر لیتا ہے۔ ربانی احکام کی بجاآوری میں کوئی تکلیف و مصیبت اسکی راہ میں آجائے تو اس پر راضی و شاکر ہوتا ہے ہمارے عیسائی بھائی تو نفس کی پہلی ہی منزل پر گھبرا اُٹھے۔ حالانکہ ازروئے تعلیم قرآن انسان کی بلند پروازی کی کوئی حد نہیں۔ اسکے اندر تو استقامت کی وہ بلند استعداد ہے۔ کہ کسی کی تحریص۔ اللہ تو درکنار مصیبت سے مصیبت بھی اسے حق و راستی سے نہیں روک سکتی مسیح ایک انسان ہی تھا۔ اسکا خدا ہونا تو آخر پیگن ازم سے ایک ماخوذ کی ہوئی داستان ثابت ہوئی جیسے کہ جدید یا لبرل عیسائیت نے سنہ ۱۹۱۱ء میں بمقام اکسفورڈ ڈین آف کارلائل کے ذریعہ اعلان کیا مسیح نفس انسانی کی اسی پانچویں منزل پر تھا جسے قرآن نے نفس راضیہ سے موسوم کیا ہے۔ وہی نفس راضیہ اسے صلیب پر لے گیا دنیا نے ہزارہا راستباز

ایسے دیکھے ہیں جنھوں نے اس مرتبے کو حاصل کیا۔ اور خدا کی راہ میں اپنی جانیں دیں۔ انہیں اسلامی اصطلاح میں شہید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی جان دیکر مشیت ایزدی پر اپنے راضی ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ اس مقام پر جب ایک انسان کامل طور سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی جناب سے اُسے رضامندی کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے اور وہ نفس مرضیہ پالیتا ہے۔ اسکی اگلی منزل نفس کاملہ کی ہے۔ جہاں زمین و آسمان کے ملکوت اس کے خادم ہو جاتے ہیں بسا اوقات مجھے عیسائی مذہب پر غور کرکے یہ خیال ہوا۔ کہ انسان عیسائی بنکر کس طرح عالی ہمتی کو حاصل کر سکتا ہے۔ ایک شخص جو پہلی منزل پر ہی نفس کے بدمیلانوں کو دیکھکر گھبرا گیا۔ اور شکار یاس ہو گیا۔ اسکی مایوسی کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نجات کو کسی دوسرے کے خون میں دیکھ رہا ہے۔ اس شخص کو ایسے بلند ہمت انسان سے کیا نسبت ہے۔ کہ جس کے سامنے اُس مقام سے بھی آگے اور منزلیں باقی ہیں کہ جس پر اول الذکر کا نجی کھڑا ہے مسیح کا زیادہ سے زیادہ مقام ایک مسلم کی نگاہ میں نفس راضیہ کا ہے تو ابھی تو اس سے آگے سالک کے سامنے دو اور منزلیں مرضیہ اور کاملہ کی موجود ہیں۔ اگر عیسائی فارن مشن مسلم دنیا میں ہر طرح ناکامیاب ہوا۔ تو اسکی وجہ بالکل بدیہہ ہے مسلم دنیا کا زیادہ حصہ ان مقامات روحانی پر اسوقت پہنچا ہوا نظر نہ آئے جو میں نے یہاں بیان کئے ہیں لیکن اسلام کی تاریخ اور روایات نے ہر صدی میں ہزارہا ایسے انسان

پیدا کئے۔ اور ہماری صدی بھی ایسے انسانوں سے خالی نہیں۔ دور کیوں جاؤ اسلامی لٹریچر اور عیسائی لٹریچر کا ہی مقابلہ کرو۔ انسانی نفس کی ترقیات اسکے کمالات اسکی استعدادات عالیہ اور پھر اون استعدادوں کو روبراہ لانیکے طریق جس وسعت کے ساتھ اسلامی لٹریچر میں پائے جاتے ہیں اس کا نام تک عیسوی لٹریچر میں نہیں ہاں نفس کی امارگی کی بہت سی بحثیں عیسائی لٹریچر میں ہمیں نظر آتی ہیں جن سے نکلنے کی راہ وہاں ایسی نظر نہیں آتی جس پر ان انسان قدم زن ہو پست ہمتی کمال درجہ پر کیوں نہ پہنچے جب ہم اپنے بوجھ کو دوسرے کی گردن پر رکھدیں۔ قرآن نے فرمایا من اهتدى فانما يهتدى لنفسه ج ومن ضل فانما يضل عليها ولا تزر وازرة وزر اخرى مسئلہ نجات کو کس خوبصورتی سے قرآن کریم نے اس آیت میں حل کر دیا۔ فرمایا جو ہدایت کے راستے پر چلیگا۔ اس نے دراصل اپنے نفس کی ہی بہتری کی۔ اور جو گمراہی کیطرف جارہا ہی۔ وہ بھی اپنے نفس کو بگاڑ رہا ہی۔ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا نہ ایک کا بوجھ دوسرے پر ڈالا جا سکتا ہی۔ اگر تو یہاں کی اور آیندہ کی عمدہ زندگی کا حصہ کسی قسم کی دولت یا نعمت بٹنے سے پر ہو۔ جو خارجاً ہمیں ملتی ہو تو خیر کسی دوسرے کے کارنامے یا اسکی سفارش ہمیں بھی کام آجائے۔ وہ کسی خزانہ نعمت سے مٹھی بھر ہمیں بھی دیدے۔ وقت تو یہ ہی کہ جو چیز یہاں یا آیندہ ہماری اصل خوشحالی کا موجب ہوتی ہی۔ وہ چیز غیر فلاح شدہ حالت میں ہمارے اندر موجود ہی ہم سے

تو اُسے ہی نشو و نما دیکر اپنی فلاح پاتی ہی۔ ترقی نفس تو ایک قسم کے نخل کا باثمر ہونا ہی جیکے جوہر اسکے اندر سے نکلتے ہیں۔ ایک درخت کا باثمر ہونا کسی دوسرے درخت بے ثمر ہونے کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ جناب مسیح تو اپنے ذاتی نخل کی آبیاری کر گئے ہاں وہ دنیا کو اس باغ کی آبیاری کے اصول تبلا گئے۔ جو ان اصولوں پر چلیگا وہ باثمر ہو جائیگا۔ عجیب بات ہی کہ جناب مسیح تو یہ فرماویں کہ ہر ایک کو اپنی صلیب آپ اُٹھانی ہوگی۔ اور ہم اُنکی صلیب کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ کیا جناب مسیح کا یہ کلام ایک بیہودہ بات ہی۔ لیکن جہاں پست ہمتی اور نامردی انسان کے قوی پر قبضہ پالے۔ تو پھر وہ دوسروں کی محنت پر نگاہ نہ رکھے تو اور کیا کرے۔

گزشتہ مارچ بمقام لاہور میں مجھے ایک پادری صاحب کی تقریر سننے کا موقع ملا۔ وہ دین حق پر تقریر کر رہے تھے۔ اثنائے تقریر میں انہوں نے یہ توضیح طور پر فرمایا۔ کہ جناب مسیح حق اور راستی پر ہیں۔ اس امر سے کس کو انکار ہو سکتا ہی۔ جو کوئی بھی راستی کی تعلیم لائیگا وہ حق و راستی کا مالک ہوگا۔ جب ایک مسلمان انہیں ایک نبی مانتا ہی۔ تو وہ مسیح کی حق و راستی سے کب انکار کر سکتا ہی۔ لیکن ان پر کیا منحصر ہے۔ لکھوکھا انسان خلق اللہ کی ہدایت کیلئے خدا کی طرف سے آئے۔ ان میں سے بعض کو مسیحی بھی خدا کی طرف سے مانتے ہیں۔ اگر یہ بزرگ خدا کی طرف سے حق و راستی لیکر نہیں آئے تھے۔ تو اور کیا لائے تھے۔ ان کو ایسا نہ سمجھنا خود اس ذات پاک پر حملہ کرنا ہی جس نے انہیں مبعوث کیا۔ پادری

صاحب نے بہت زور ایک اور امر پر بھی دیا انہوں نے کہا کہ انکے نفس میں بہت سی خباثتیں بھری ہوئی ہیں۔ اور انکا قلب بہت ہی گندہ ہے جب وہ خود کہتے ہیں۔ تو ہمیں اسکے ماننے میں کیا انکار ہو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ابھی تک پادری صاحب نفس امارہ کی حکومت سے نہیں نکلے۔ نہ تو جناب مسیح کی تعلیم نے اور نہ انکے کفارے نے ابھی تک پادری صاحب کو کوئی فائدہ دیا۔ اگر عیسائی دنیا نے جسکا بہترین نمونہ مغربی دنیا ہے۔ کفارہ مسیح کے ذریعہ نفس امارہ کی حکومت سے نجات پائی ہوتی۔ تو شاید پادری صاحب کی اُمید بھی ایک دن بر آتی لیکن تیسری چوتھی صدی مسیحی سے لیکر سولہ سترہ صدی تک جو اخلاق کا تاریک نقشہ یورپ نے دکھلایا۔ وہ نسخہ کفارہ کو بے اصل کر دکھلاتا ہے۔ رہا آج کا یورپ۔ سو گزشتہ جنگ عظیم نے جو یورپ کا اندرونہ نقشہ دکھلایا۔ اس نے یورپ کے اہل الرائے کو خود کلیسائی تعلیم سے مایوس کر دیا۔ اور انکا مایوس ہونا امر حقہ ہے لیکن ہمیں حیرت تو اسبات سے آتی ہے۔ کہ یہ بزرگ صدیوں تک کس بھروسہ پر بیٹھے رہے نفس کی پلیدگی اور اُس میں بدی کی طرف میلان ہونا تو ایک مسلمہ بات ہے انجیل کیا کسی مذہبی اخلاقی کتاب کو اُٹھا دیکھو نفس انسان کی خرابی کے نقشے کتاب میں موجود ہیں خود قرآن نے نفس امارہ کے متعلق انا النفس لامارۃ بالسوء کہکر حقیقت حال سے ہمیں اطلاع دیدی ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ ان کتابوں میں اصلاح نفس کی کیا تجویز ہے۔ کیا کسی درخت کے تخم میں خراب ہو جانے کے اسباب نہیں ہوتے لیکن وہی تخم

ایک باغبان کے ہاتھ تلے آکر اپنے بہترین جوہروں کو ظاہر کر دیتا ہے ۔

قرآن کریم نے صرف نفس انسانی کی غلط میلانوں کو ہی نہیں بتلایا۔ بلکہ ایسے میلانوں کے اسباب بھی نہایت حکیمانہ طریق پر گن دیئے۔ پھر ان مواقعے سے بھی ہمیں اطلاع دی۔ کہ جہاں بالخصوص ہمارا پاؤں پھسل جاتا ہے جن کی تفصیل کے یہ اوراق متحمل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ایک تو وہ طویل بحث ہے۔ دوسرا اس میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن سے علی العموم اور مذہب کے لوگ بھی کم و بیش واقف ہیں لیکن قرآن کریم میں جو عجیب بات ہے وہ یہ ہے۔ کہ اس کتاب مجید نے انسان کے نفس اور اسکے ادراک (سائی کالوجی) کو ہمیشہ سامنے رکھا ہے۔ اور اس کے ایسے اندازوں پر ہمیں اطلاع دی کہ جن سے انسان علی العموم ناواقف رہتا ہے اور اسکے اپنے قوای حسیدا سے دھوکا دیدیتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ان لوگوں کے متعلق جو ادنٰی خواہشات نفس کے غلام ہو جاتے ہیں۔ اور ان خواہشات کو ہی اپنا خدا بنا لیتے یعنی وہ خواہشات ردیہ کے پورا کرنے کیلئے اپنی کل قوتوں کو رات دن استعمال کرتے رہتے ہیں جیسے کہ آجکل کے مدعیان تہذیب کا زیادہ حصہ نظر آتا ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے۔ کہ وہ دل تو رکھتے ہیں۔ لیکن وہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ آنکھ ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ کان ہوتے ہوئے نہیں سنتے۔ وہ کالانعام ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ رات دن کھانے پینے اور پہننے کی فکر میں رہنا ایک حیوان کی زندگی نہیں تو اور کیا ہے

۵ قرآن سورہ ساعت آیت ۱۷۶ اور ۱۷۹

دراصل عیسائیوں نے ایک بات میں غلطی کھائی۔ انہوں نے فطرت اور اسکی استعداد کو ایک دوسری سے جدا نہ کیا اور دونوں کو ایک چیز سمجھا۔ حالانکہ فطرت میں بہت سی استعدادیں ہیں۔ اس میں بدی کی طرف جانے کی استعداد تو ہے۔ لیکن نیکی کی استعدادیں بھی فطرت میں موجود ہیں عیسائیوں نے فطرت کی استعداد بد کو ہی فطرت انسان سمجھ لیا۔ اور اس سے گھبرا کر ہر ایک خوبی سے مایوس ہو گئے۔ ان مایوسین کو بلند ہمت بنانے کیلئے قرآن کریم نے یہ خوشخبری دی۔ کہ انسان تو اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاقی اور روحانی ترقی کی استعدادیں اپنے اندر رکھتا ہے بشرطیکہ وہ صحیح راستے پر قدم زن[1] ہو۔ ہم نے نفس انسانی کی جن ترقی یافتہ منازل کا اوپر ذکر کیا۔ ان کا کوئی نہ کوئی رنگ ہمیں سخت سے سخت قسی القلب لوگوں میں بھی نظر آجاتا ہے۔ کیا سنگدل مجرم بھی بعض وقت اپنے افعال پر پشیمان ہوتے نظر نہیں آتے۔ یہ نفس کی اس ترقی یافتہ ایک جھلک ہے جسے قرآن نے نفس لوامہ کہا۔ کیا بدکردار لوگ اپنے اہل و عیال کی پرورش نہیں کرتے۔ کیا وہ بعض وقت اپنی کو نیک کاموں کی نذر نہیں کر دیتے کسی غرض کو پورا کرنے کیلئے کیا وہ سخت سے سخت مصیبت کا مقابلہ نہیں کرتے۔ اور اسطرح استقامت نہیں دکھلاتے۔ یہ باتیں تو اعلیٰ اخلاق کی ہیں ان بدعملیوں میں نیکیوں کا نظر آنا کوئی امر استعجاب نہیں اسکی مثال یہی ہے کہ گھنگھور گھٹاؤں اور تاریک بادلوں کے کنارے پر آفتاب کی کرنیں بعض وقت چمکتی نظر آتی ہیں۔ تاریک بادل تو اسبات کا ثبوت نہیں ہوتے کہ کائنات

[1] قرآن سورہ ۱۰ آیت ۷ الغایۃ سورہ ۹۱ آیت ۱۰ تا ۱۰

سے آفتاب گم ہوگیا۔ آفتاب تو موجود ہے۔ ہاں سیاہ بادلوں نے چھپا رکھا ہے یہی بست فطرت کا حال ہے +

اب میں مختصراً ان صلاحوں کا ذکر کر دیتا ہوں جنکے ذریعہ قرآن کریم نے انسان کو نفس امارہ کیحالت سے نکالنا چاہا ہے سب سے پہلے قرآن حمید نے پہلے ہی رکوع میں ہیں انسانی سائیکولوجی (مدرکہ) کی ان غلط راہوں سے اطلاع دی جنپر بعض وقت انسان بلا ارادہ بھی یا دفع الوقتی کے طور پر چل نکلتے ہیں۔ یا جنکی وہ پروا نہیں کرتے اور یہی امر انکی تباہی کا موجب ہو جاتا ہے۔ ان غلطیوں سے بچنے پر ہی انسان ہدایت کے راستے پر قدم زن ہو سکتا ہے کس قدر حکیمانہ یہ کتاب ہے۔ اور ہدایت کا کس قدر نظام ابلغ اس میں موجود ہے۔ اگر کوئی کتاب انسانی ہدایت کے لئے آئے۔ تو اس کا سب سے پہلا فرض یہی ہے کہ وہ ہمیں گمراہی کی راہوں سے متنبہ کرے۔ اور علی الخصوص مزاج انسانی کی ان غلط راہوں سے ہمیں واقف کر دے۔ کہ جنکے موجود رہنے پر انسان ہدایت کی طرف نہیں جاتا۔ اور جنہیں علی العموم انسان غلطی نہیں سمجھتا۔ قرآن نے مزاج انسانی کے ان مغالطوں کو سات قسم میں منقسم کیا ہے۔ ان میں پانچ کا ذکر تو پہلے ہی رکوع میں کر دیا۔ باقی دو کسی اور مقام پر بیان فرمائے درحصل باقی کی دو باتیں پہلی پانچ باتوں میں ہی آجاتی ہیں +

(۱) اول ہدایت اور گمراہی دونوں سے لاپروائی کرنا یعنی نہ کسی نیک نتایج کیطرف توجہ کرنا اور نہ کسی تربیت کا خوف رکھنا ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا:۔

(البقرہ آیۃ)
ان الذین کفروا سواء علیہم ءانذرتہم ام لم تنذرھم لا یؤمنون
(۲) منافقت۔ ومن الناس من یقول اٰمنا باللہ وبالیوم الاٰخر وما ھم بمومنین۔ البقرہ۔ آیت ۸) یہ لوگ زبان سے تو کہتے ہیں۔ کہ ہم صداقت اور ہدایت کی راہوں کو تو مانتے ہیں لیکن ان کے دل میں ایمان نہیں ہوتا +
(۳) دورخہ پن طبیعت کا یہ انداز نہایت ہی خطرناک ہے۔ اس میں عموماً وہ لوگ بھی گرفتار ہوتے ہیں۔ جو اپنے آپکو اہل الرائے سمجھتے ہیں۔ وہ کسی قدر صحیح رائے ضرور ہوتے ہیں لیکن دنیوی اغراض یا ہمدردی انہیں صحیح راہ پر گامزن ہو جانے نہیں دیتی۔ وہ ایک صداقت کی خوبیوں کو بھی ایک حد تک تسلیم کر لیتے ہیں لیکن چونکہ ہر نئی صداقت دنیا میں موجب فساد ہو جاتی ہے۔ اور ہر ایک مصلح کے مقابل موافق اور مخالف دو جماعتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسے لوگ دونوں جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ دونوں کے ساتھ ہاں میں ہاں ملایا کرتے ہیں۔ اور اپنے دل میں سمجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ کہ انکے اس مرنجاں مرنج طریق سے فساد مٹ جائیگا۔ اور دو فریقوں میں کوئی نہ کوئی مصالحت کا راستہ نکل آئیگا۔ وہ بعض وقت فی الواقع منافق بھی نہیں ہوتے لیکن انکی وجاہت طلبی انکی راہ میں انکی ہدایت کی روک ہو جاتی ہے۔ وہ دراصل دھوکے میں ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے اس طریق عمل سے زیادہ فساد پیدا ہوتا ہے جیسا کہ قرآن نے کہا۔ واذا قیل لھم لاتفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون (البقرہ۔ آیت ۱۱)

(۴) تکبر و استحقار یعنی تعلیم ہدایت کے متعلق یہ سمجھنا کہ یہ باتیں ادنیٰ لوگوں کے متعلق ہیں یا بیوقوف لوگوں کیلئے ہیں اور اپنے آپ کو اس سے ارفع سمجھنا چنانچہ قرآن نے فرمایا
واذا قیل لھم امنوا کما امن الناس قالوا انؤمن کما امن السفھاء الا انھم ھم السفھاء ولٰکن لا یعلمون ۔ البقرہ ۔ آیت ۱۳ ×

(۵) کسی نیک تحریک میں بطور مذاق شریک ہونا ۔ واذا لقوا الذین امنوا قالوا امنا واذا خلوا الی شیٰطینھم قالوا انا معکم انما نحن مستھزءون (البقرہ ۔ آیت ۱۴)

(۶) عدم قوت فیصلہ یعنی کبھی ادھر کبھی ادھر ہو جانا ۔ مذبذبین بین ذٰلک لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء ومن یضلل اللہ ولن تجد لہ سبیلا (النساء ۔ آیت ۱۴۳)

(۷) آبائی رواج کی غلامی ۔ واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباءنا اولو کان اباؤھم لا یعقلون شیئًا ولا یھتدون (البقرہ ۔ آیت ۱۷۰)
جب انہیں کہا جاوے کہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی باتوں کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو انہیں باتوں کی پیروی کرینگے جن پر ہم نے آباؤ اجداد کو دیکھا ۔ خواہ اُن کے آباؤ اجداد کچھ بھی نہ سمجھتے یا خود ہدایت سے دور ہوں ×

قرآن کریم نے چند اور باتوں کی طرف بھی انسان کو متوجہ کیا ہے لیکن وہ سب میرے نزدیک مذکورہ بالا سات باتوں میں آجاتی ہیں ۔ قرآن کریم نے ان امور کا ابتدا ہی میں ذکر کر کے ہمیں تنبیہاً اطلاع دیدی ہے کہ اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک یا ... اندر موجود ہو تو ہم اس سے الگ ہو جائیں ۔ کیونکہ نفس میں ان باتوں کا ہونا ہی ترقی

نفس کے مخالف ہے۔ قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جس نے نفس کی ابتدائی سے ابتدائی حالت کو سامنے رکھکر اسے بلند سے بلند مقام پر پہنچانا چاہا ہے۔ نادان لوگ قرآن کریم کے بعض احکام کو پڑھکر بول اٹھتے ہیں۔ کہ یہ باتیں تو غیر مہذب اقوام سے متعلق ہیں لیکن قرآن تو ہر انسانی طبقہ کیلئے آیا ہے۔ اور دنیا تو ایسی قوموں سے خالی نہیں ہوئی۔ اسلئے جو کتاب نسل انسانی کے ہر طبقے کیطرف آوے۔ اس میں کیوں افریقہ یا جاہلی کی اصلاح کا علاج نہ ہو۔ اور وحشی علاقوں پر کیا منحصر ہے۔ قرآن کریم کی ان احکامات میں جو نسل انسانی کی ابتدائی سوسائٹی کی تہذیب کیلئے تجویز ہوتے ہیں میں تو ایسی باتیں پاتا ہوں۔ کہ جن کی ضرورت اعلیٰ سے اعلیٰ متمدن قوموں کو بھی ہے۔ زنا۔ قمار بازی۔ شراب خوری کو قرآن کریم نے ان بدیوں میں شمار کیا ہے۔ جو انسان کی ابتدائی سوسائٹی میں پائی جاتی ہیں۔ پھر کیا یہ باتیں یورپ سے مٹ چکی ہیں۔ اصلاح اخلاق کیلئے سب سے پہلے اصلاح جسم کی ضرورت ہے صحیح جسم میں ہی صحیح دماغ ہوتا ہے۔ اور صحت دماغ ہی سے صحت روح وابستہ ہے۔ صفائی جسم اور عمدگی خوراک کا اثر انسان کے اخلاق پر ہوتا ہے یہ ایک صحیح نظریہ ہے۔ اسلئے اگر صحت اخلاق و زود حاجت کیلئے قرآن کریم اسے اکل شرب کی چیزوں کو روک دے۔ تو ضروری ہے خصوصاً ایسی چیزیں وہ افسان شیر یا در کیطرح استعمال کرتے ہیں جو مدعیان تہذیب ہیں ایک شراب خور یا سور کے کھانے والا اگر وہ روحانیت کے خواب دیکھتا ہے۔ تو وہ سخت دھوکے میں پڑا ہوا ہے شراب خور کا دماغ اس صفائی کو کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ جو مکاشفات

صحیحہ کیلئے ضروری ہے ایسی ہی روحانیت کیلئے قلب صفا کی ضرورت ہے۔ دل پر معدے
کے بخارات ردیہ کا کوئی اثر نہ ہونا چاہئے بشہویہ ہیجانوں سے بھی دل و دماغ
خالی ہونا چاہئے بالمقابل شراب و سؤران دونوں باتونکو پیدا کرتے ہیں قرآن
کریم نے صفائی جسم کیلئے اگر خاص طور پر زور دیا اور صفائی کے خاص خاص طریقو
کا ذکر کیا۔ تو اکی اہمیت اور ضرورت مجھے یورپ میں جاکر جیسے معلوم ہوئی وہ
ہندوستان میں رہکر کبھی محسوس ہوئی گردن و منہ اور ہاتھونکو دھولینا اور منہ
پر پوڈر مل لینا صفائی و جسم کیلئے مکتفی نہیں جیسے کہ دھاں ہوتا ہے بمغربی ممالک میں
صدہا نہیں۔ ہزاروں گھر ایسے ہیں جہاں غسلخانہ کا نام نہیں۔ پھر کی صفائی اور طہارت بہائی

الغرض قرآن کریم نے سب سے پہلے کھانے پینے۔ لباس۔ صفائی جسم اور معمولی
زندگی کی اصلاح کے آداب سکھلائے۔ گویا انسان کو حیوانیت سے نکالکر اسے سطح انسانیت
کا پہلا جامہ پہنایا یہ سب سے بڑا مرحلہ جو تہذیب نفس کے لئے ازبس ضروری ہے۔ وہ مدرکہ انسانی
میں نفس لوامہ کو پیدا کرنا ہے میں نے اس سے پہلے بیان کیا ہے۔ کہ انسان امارگی کیحالت
میں اپنی خواہشات ردیہ کا غلام ہوکر تمدن و تہذیب کے ہر بات کو توڑنے پر طبعاً امادہ
ہوتا ہے۔ اور اس حالت میں اپنے افعال حیوانیہ کو برا نہیں سمجھتا۔ بلکہ انہیں صحیح سمجھتا ہے
اور ایسے افعال کا کرنا ہوتا ہے۔ افریقہ کے غیر متمدن علاقوں میں جاکر انکے شہروں پر
زبردستی کرنا اور باشندوں کو غلام بنالینا یہ حیوانیت نہیں تو اور کیا
ہے پھر اسکا کام یورپ نے فتحمندی رکھا ہوا ہے۔ سو اصلاح کی پہلی منزل یہ ہے۔ کہ انسان

کے اندر بدی کا احساس اور اس سے نفرت اور نیکی کی عزت و محبت پیدا کیجائے
یعنی اسکے نفس امارہ کو اس حالت میں بدل دیا جائے۔ جسے عامہ اصطلاح میں
کانشنس کہتے ہیں۔

عام طور پر لوگوں کو یہ غلطی لگی ہوئی ہے۔ کہ کانشنس ہر ایک انسان میں طبعاً موجود ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر ایک انسان میں طبعاً بدی سے نفرت اور نیکی کا میلان ہے۔ یہ امر غلط ہے ہم میں یہ سب استعدادیں موجود ہیں لیکن وہ تو غیر نشوونما حالت میں ہوتی ہیں۔ انکی آبیاری سے کانشنس پیدا ہوتا ہے۔ اگر کانشنس بعبارت دیگر یا نفس لوامہ ہے تو ہماری نواحی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے جس قسم کے اخلاق ہمارے ہمسایہ ہمارے خاندان یا اس سوسائٹی کے ہوتے ہیں جس میں ہم پرورش پاتے ہیں۔ وہی اخلاق ہمارے ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ امر صحیح نہیں کہ ایک سوسائٹی جس بات کو برا جانتی ہے اسی کو دوسری اچھا سمجھتی ہے شراب نے ہزاروں سال انسان پر حکومت کی اسکے خلاف اگر مغرب کا کانشنس نفس لوامہ بنا تو آج بنا اگر کانشنس کوئی طبعی قوت انسان میں ہوتی تو ہر ایک شخص کے اندر وہ کانشنس ایک ہی طریق پر کام کرتی۔ مثلاً جہاں تک ہماری جسمی ترقی کا سوال ہے جسم کیلئے مضر چیزیں ہر ایک جسم پر یکساں اثر کرتی ہیں مکھی کا کسی کے معدے میں چلا جانا خواہ معدہ انگریز کا ہو خواہ ہندوستانی کا۔ عیسائی کا ہو یا ہندو کا ایک ہی طرح قے کا موجب ہو جاتی ہے۔ انسانی معدہ ایک ہی طرح ہر جگہ مضر چیز کی مخالفت کرتا ہے۔ کانٹے کا جسم میں چبھنا۔ آنکھوں میں کسی غیر چیز کا چلا جانا

جسم انسانی پر ایک ہی طرح کی تکلیف پیدا کرتا ہے۔ اب اگر کانشنس وہ چیز ہے جو بُری چیزوں کے مقابل انسان کے قلب میں تکلیف پیدا کرے۔ اور نیکی کی چیزوں پر اطمینان اور راحت پیدا کرے۔ تو پھر کل انسانوں کے قلب میں بعض حالات و خیالات پر ایک ہی طرح کا احساس پیدا ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ یہ بات نہیں مشاہدہ اسکے خلاف ہے۔ ایک مسلمان یا ایک عیسائی بعض جانوروں کے ذبح کرنے میں کوئی عیب نہیں دیکھتا۔ حالانکہ یہی بات ایک جینی یا بدھ کے دل کو سخت تکلیف دیتی ہے اسکا کانشنس اسکو نہایت ہی برا سمجھتا ہے۔ یہ متضاد حالتیں اگر نواحی یا ذاتی حالات کا نتیجہ نہیں۔ تو اور کیا ہے جینی اور بدھ نے بچپن ہی سے ان باتوں کو نفرت سے دیکھا ایک مسلمان اور ایک عیسائی بچے نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے دیکھا۔ یہ تو میں نے ایک معمولی مثال دی ہم تو بڑے بڑے معاملات اخلاق و تمدن میں مختلف اقوام کے بالمقابل متضاد باتیں دیکھتے ہیں ایک دوسرے کو ان باتوں پر ملامت کرتے ہیں اور ہر ایک ایسا کرنے میں کسی مفروضہ کانشنس پر ہی زور دیتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر انسانوں میں کانشنس ایک طبعی بات ہوتی ہے تو پھر تو پسندیدگی اور غیر پسندیدگی کی باتیں ہر جگہ یکساں ہوتیں مختصر الفاظ میں کانشنس کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ نفس انسانی کی وہ قوت ہے جو انسان کی نگاہ میں اضطراراً کسی فعل پر نفرت اور کسی دوسرے فعل پر پسندیدگی پیدا کر دیتی ہے لیکن جس بات کو زید پسند کرتا ہے۔ بکر کو اس سے طبعاً نفرت ہوتی ہے جس چیز کو لوگوں نے کانشنس سمجھا ہوا ہے۔ وہ دراصل ان

تجارب کے مجموعے کا نام ہے جو قلب انسانی میں اسکے نواحی حالات یا تعلیمات پیدا کر دیتی ہیں انجام اس سے کہ وہ فی نفسہ نیک ہوں یا بد علاوہ ازیں کانشنس کو تو ادراک انسانی سے تعلق ہے اور ادراک انسانی تو ان علوم کے سانچے میں ڈھلتا ہے جو خارج سے اسکے دل و دماغ میں آتا ہے۔

الغرض نفس انسانی کی اس حالت کو جب اسکے دماغ میں حقیقی نیکی اور حقیقی بدی کا کوئی احساس نہ ہو بلکہ نیکی و بدی اسکی نگاہ میں اسکے ذاتی منفعت کے حصول سے وابستہ ہو وہی چیز اسے اچھی نظر آئے جس میں اسکا ذاتی فائدہ ہو اور اس چیز کو وہ برا سمجھے جو اسکے ذاتی مفاد کے خلاف ہو یعنی ذاتی مفاد ہی اسکا خیر و شر ہو۔ اسی نفس میں اس ادراک کا پیدا کر دینا کہ کوئی چیز خواہ اسکے ذاتی مفاد کیلئے کیسی ہی مفید ہو لیکن چونکہ فی نفسہ وہ بد ہے اسلئے اس سے اسے مجتنب رہنا ہے۔ اور ایسے ہی کوئی ایسی چیز جو خواہ کتنی ہی اسکے ذاتی مفاد کے خلاف ہو وہ چونکہ فی الاصل خیر ہے وہ اسے ضرور کرتی ہے۔ اس ادراک کا انسان میں پیدا ہو جانا اسکی ترقیات نفس کیلئے از بس ضروری ہے اس ادراک کا نام قرآن کریم نے نفس لوامہ رکھا ہے اور اسی کو عام اصطلاح میں کانشنس کہتے ہیں۔

نسل انسانی کا زیادہ حصہ تو ایسا ہے کہ جن میں خداوند کریم کے احکام کی بجا آوری کا جذبہ بڑے زور شور سے کام کرتا ہے خواہ وہ کسی مذہب ملت سے تعلق رکھتے ہوں خدا تعالیٰ کا تقدس اور اسکی محبت یا اسکا خوف قلبی کیفیت کو ہر جگہ بدلتا ہے۔ انسان طبعاً ایسی باتوں سے محبت رکھتا ہے جن سے اسکے علم و یقین میں خدا تعالیٰ محبت رکھتا ہو یا ایسی

جس بات سے خدا کو نفرت ہو اس سے وہ بچنا چاہتا ہے۔ اس فطرت انسانی کو سامنے رکھکر قرآن کریم نے چند باتوں کا ذکر کرکے دنیا کو اطلاع دی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے محبت رکھتا ہے۔ اور ان چیزوں کو وہ پسند نہیں کرتا۔ اگر کسی قوم کے کانشنس کا جائزہ لیا جائے۔ اور ان باتوں پر غور کیا جائے جنہیں اس قوم کا کانشنس پسند یا ناپسند کرتا ہے۔ تو ان سب کی تہ میں وہی تعلیمات نظر آوینگی۔ جو قوم مذکور نے خدا کیطرف سے آئی ہوئی سمجھی۔ اس تعلیم کے قالب میں اس کا کانشنس ڈھل گیا یہی حقیقت ہے ہمارے کانشنس کی بناوٹ ہی خدا کی پسندیدگی اور عدم پسندیدگی پر واقع ہوتی ہے۔ خدا کی خوشی اور اسکی ناراضگی ہی کل اخلاق کی آساس ہے۔ لہذا نفس تعمیر کانشنس کیلئے یا نفس امارہ کو نفس لوامہ میں متبدل کرنے کیلئے قرآن ہمیں اطلاع دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ جو نیکی کے کام کرتے ہیں[۱] (پھر اور مواقع پر نیکی کے کام بھی گن دیئے) جو معاملات میں عدل و انصاف پر کاربند ہوتے ہیں[۲]۔ جو تطہیر جسم و نفس کا خیال رکھتے ہیں[۳]۔ جو خدا کی جناب میں توبہ اور انابت[۴] کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ پر بھروسہ[۵] رکھتے ہیں جو متقیانہ کام کرتے ہیں[۶]۔ اور سچ بولتے ہیں +

اسیطرح قرآن کریم تعلیم کرتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت اور پیار نہیں کرتا جو حد[۷] اعتدال سے بڑھ جاتے ہیں۔ جو ضرر اور نقصان[۸] کے کام کرتے ہیں۔ جو ناشکرگزار ہوتے[۹] ہیں

[۱] سورۃ ۲۔ آیت ۱۹۵ [۲] سورۃ ۵ آیت ۴۲ [۳] سورۃ ۲۔ آیت ۲۲۲ [۴] سورۃ ۲ آیت ۲۲۲۔ [۵] سورۃ ۳۔ آیت ۱۵۹ [۶] سورۃ ۳۔ آیت ۷۶ [۷] سورۃ ۲۔ آیت ۱۹۰ [۸] سورۃ ۲۔ آیت ۲۰۵ [۹] سورۃ ۲۔ آیت ۲۷۶ +

جو ظلم کرتے ہیں۔ غرور کرتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں۔ دغا بازی کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو تکلیف دینے والے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ فضول خرچی کرتے ہیں۔ ایفائے عہد نہیں کرتے۔ اور وفا کی راہوں سے دور رہتے ہیں اور ہر قول و فعل میں شیخی اور مبالغات کی باتیں کرتے ہیں +

پھر فرمایا کہ خدا کی لعنت ان پر وارد ہوتی ہے۔ جو بے ایمان ہوتے ہیں اور جادو منتر جنتر اور توہمات پر اپنا ایمان قایم کرتے ہیں۔ جو شرک اور منافق ہوتے ہیں۔ جو نیک راہ سے ہو پھر جاتے ہیں۔ جو معاہدات کو توڑتے ہیں۔ راستی کو چھپاتے ہیں۔ صداقت کا مقابلہ کرتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں قتل کرتے ہیں۔ اور خدا اور اسکے رسولوں کو برے الفاظ سے یاد کرتے ہیں ایسے ہی ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جو اس دنیا میں اور آیندہ دنیا میں خیر و خوبی اور فلاح کے مالک ہونگے۔ انکے بعض اخلاق کا بھی ذکر کر دیا۔ مثلاً جو صداقت کو مانیں اور اسپر ایمان لائیں۔ خدا کے احکام پر چلیں۔ صداقت سے کام لیں صبر دکھلائیں منکسر المزاج ہوں خیرات اور صدقات میں ساعی ہوں۔ روزے رکھیں۔ خواہش سے بچیں۔ اللہ تعالے کا ذکر کرتے رہیں۔ اسکی جناب میں جھکے رہیں نیکیوں کی طرف لوگوں کو ترغیب دیں اور بدیوں کے برخلاف وعظ و نصیحت کریں اور حدود الٰہیہ کیطرف حفاظت کریں

قرآن نے ان باتوں کو ایک ہی جگہ جمع نہیں کیا۔ نہ قرآن کریم کے کسی صفحہ یا کسی سورۃ میں۔ ان سب امور کا ذکر کر دیا۔ نہ انہیں کسی خطبہ یا وعظ کے رنگ میں بیان کیا

۵ سورۃ۔ آیت ۵۶ ۔ ۶ سورۃ ۱۶۔ آیت ۲۳ ۔ ۷ سورۃ ۴۔ آیت ۳۶ ۔ ۸ سورۃ ۱۷۔ آیت ۱۰۷ ۔ ۹ سورۃ ۴ آیت ۱۴۸ ۔ ۱۰ سورۃ ۶۔ آیت ۱۴۰ ۔ ۱۱ سورۃ ۲۲۔ آیت ۳۸ ۔ ۱۲ سورۃ ۲۳۔ آیت ۷۶ ۔ ۱۳ سورۃ ۳۔ آیت ۹۴ ۔ ۱۴ سورۃ ۹ آیت ۵۱ و ۲۵ ۔ ۱۵ سورۃ ۴۸ آیت ۲۵ ۔ ۱۶ سورۃ ۹ آیت ۶۸ ۔ ۱۷ سورۃ ۴۷ آیت ۲۳ ۔ ۱۸ سورۃ ۵ آیت ۲ ۔ ۱۹ سورۃ ۲ آیت ۵۹ ۔ ۲۰ سورۃ ۳ آیت ۷۰ ۔ ۲۱ سورۃ [illegible] آیت ۹۰ ۔ ۲۲ سورۃ ۹ آیت ۹۳ ۔ ۲۳ سورۃ ۳۳ آیت ۵۷ ۔ ۲۴ سورۃ ۹ آیت ۱۱۲ ۔ ۲۵ سورۃ ۳۳ آیت [illegible]

اور موقعہ بموقعہ انہوں لفاظ لعنت وبرکت سے سجایا۔ یہ طریق طبیعت انسانی کو چنداں مرغوب نہیں نہ یہ مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ بلکہ ان امور کو فرداً فرداً مختلف مقامات پر بیان کیا ہے بعض وقت فطرت انسانی کی نقائص کی طرف انسان کو متوجہ کرکے ان باتوں کا جستہ جستہ ذکر کردیا کہیں گزشتہ قوموں کیطرف اشارہ کرکے انکی ناکامیوں یا کامیابیوں کا جہاں ذکر کیا ہے۔ وہاں مذکورہ بالا حسنات یا سیئات کو انکی ناکامی یا کامیابی کا باعث بتلایا ہے یعنی ان سب امور کو ایسے دلچسپ اور معقول پیرایہ بھی بیان کیا۔ کہ قرآن کریم کا پڑھنے والا خدا کا قایل ہو یا نہ ہو وہ اگر قرآن کریم کا مطالعہ کرے تو وہ اسکے مواعظ حسنہ کے سامنے سر جھکا دیگا

الغرض قرآن کریم کی تعلیم اور اسپر انسان کا عمل اسکے نفس میں وہ اور اک کیفیت پیدا کردیگا جسے کانشنس نفس لوامہ کہتے ہیں جن خلاق پاکیزہ خلقیوں کا ہمنے ذکر کیا ہے وہ دراصل خلاق کی ابتدائی منازل ہیں ہاں جب انسان انمیں پختہ کار ہو جائے تو پھر قرآن کریم اخلاق فاضلہ کا سبق دیتا ہے مسئلہ اخلاق کے سمجھنے میں مذہبی دنیا نے بہت دھوکا کھایا چند نرم دلی کی باتوں کو وہ اخلاق سمجھ لیتے ہیں اور ہر ایک ایسی بات کو جسمیں درشتی یا سختی کا رنگ ہو اسے بدخلقی سے تعبیر کرتے ہیں خواہ وہ انسان کے کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو۔ اخلاقیات میں قرآن کریم نے دنیا پر یہ راز کھولا کہ انسان کے جذبات یا طبعی تقاضے جب اپنے صحیح محل اور موقع پر استعمال ہوں تو وہی اخلاق فاضلہ کہلاتے ہیں پھر محل و مواقع کا ذکر کرکے اس مسئلے کو روشن کیا ہے مثلاً کسی کی یہ کہدینا کہ مبارک وہ ہیں جو دل کے غریب ہیں کوئی علمی تعلیم اخلاق نہیں۔ اس سے اول تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ غریبی دل کیا ہوتی ہے عدم تہور کا نام دل کی غریبی نہیں۔ ایک بھیڑ بکری اور گاے

بھی دل کی غریب ہوتی ہو۔ اس معاملہ میں تو ان جانوروں کا انکسار لکھو کھا انسانوں سے بڑھا ہوا ہے لیکن کیا کوئی انہیں کہہ سکتا ہو۔ کہ یہ بڑی اعلیٰ اخلاق سے متصف ہیں ایک قمار بازکی نگاہ میں روپیہ کی قدر نہیں ہوتی۔ وہ اگر قومی معاملات میں کسی تحریک تحریص کے نیچے آکر بہت سا روپیہ بطور چندہ دیدے یا دیا کرے وہ سخی تو نہیں کہلا سکتا اسلئے قرآن نے سخاوت کی لازمی شرط کسب حلال ٹھہرادی ہو اسیطرح ایک شخص کسی بدی پر استطاعت ہی نہیں رکھتا یا سوسائٹی کے خوف سے اسے کسی بدی کرنے کی جرأت ہی نہیں۔ تو وہ نیک تو نہیں کہا سکتا یہ تو ستر بی بی از بی چادری کا معاملہ ہو۔ ایک سپاہی چندہ روپیہ پا ہوا لیکر یا کسی تمغہ کے خیال سے جنگ کی صف اول میں جا لڑتا ہو۔ تو وہ شجاع نہیں کہلا سکتا۔ حقیقی شجاعت از روئے تعلیم قرآن کریم اس شخص میں ہوتی ہو جو صداقت کی حمایت پر کھڑا ہو۔ اور صداقت کے کھڑا کرنے پر اپنی جان و مال کو لڑا دے۔ ایک شخص جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو اور اس کی وجہ یہ ہو کہ اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی واقع نہ ہوئی اور یہ امر تو اچھا ہو لیکن اسے راست گفتار کی اعلیٰ صفت سے ہم متصف نہیں سمجھتے۔ صادق القول وہی ہو کہ جب سچ بولنے سے مال عزت اور جان معرض خطر میں ہو۔ اس وقت بھی ایک شخص راست گفتاری کو نہ چھوڑے۔ الغرض قرآن کریم نے انسانی کانشنس کو بیدار کرکے اس کے آگے اخلاق فاضلہ کو پیش کیا اور ان کا محل و موقع بھی بتلایا۔ ان میں سے میں یہاں چند ایک کا ذکر کردیتا ہوں اور فٹ نوٹ میں ان آیات کا حوالہ دیدیتا ہوں جہاں قرآن کریم نے ان کی تعریف اور محل و موقعہ بتلاتا ہو +

قرآن کریم نے اخلاق فاضلہ کی دو قسمیں کی ہیں۔ اول وہ جن پر عمل پیرا ہونے سے مخلوق الٰہی انسان کے شر سے بچ جائے اور دوسروں کا مال جان اور عزت مامون و محفوظ ہو جائے۔ دوم وہ اخلاق فاضلہ جن پر ہمارا کاربند ہونا دوسروں کے نفع کا موجب ہو۔ آنحضرت صلعم نے ایک طرف تو اسلام کی تعریف میں یہ فرمادیا کہ مخلوق اللہ سے شفقت کرنا اور دوسری طرف یہ کہا کہ مسلم وہ ہے جس کے ہاتھ یا زبان سے کسی کو نقصان نہ پہنچے اسلام اور مسلم کی تعریف کے ان دو پہلوؤں کو سامنے رکھکر قرآن نے اخلاق فاضلہ کی تقسیم کی +

پہلی جماعت میں قرآن مجید چار اخلاق کا ذکر کرتا ہو۔ عفت[1]۔ دیانت[2]۔ انکسار و حلم[3]۔ خوش اخلاقی[4] لوگوں کو اچھے الفاظ میں مخاطب کرنا اور ان کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کہنا جس سے دل کو صدمہ پہنچے۔ یا ان کی عزت کا ازالہ ہو +

قسم دوم میں بھی قرآن مجید نے چار بڑے اخلاق کا ذکر کیا ہے عفو[5]۔ احسان[6]۔ شجاعت[7]۔ صداقت[8] +

۱۸۸

[1] سورہ ۲۴۔ آیت ۳۳۔ سورہ ۲۔ آیت ۲۷ [2] سورہ ۷۔ آیت ۶۔ ۱۰۔ سورہ ۲۵۔ آیت سورہ ۴۔ آیت ۶۱۔ سورہ ۶۔ آیت ۶۰۔ سورہ ۲۶۔ آیت ۱۸۲۔ سورہ ۴۔ آیت ۲۔ [3] سورہ ۸۔ آیت ۱۔ سورہ ۴۔ آیت ۱۲۷۔ سورہ ۸۔ آیت ۶۱۔ سورہ ۲۵۔ آیت ۶۳ و ۷۲ سورہ ۲۲۔ آیت ۲۴ [4] سورہ ۲۔ آیت ۷۱ سورہ ۴۹۔ آیت ۱۱ و ۱۲ سورہ ۱۷۔ آیت ۳۸[5] سورہ ۵۲۔ آیت ۴۰۔ سورہ ۳۔ آیت ۱۳۳ [6] سورہ ۱۶۔ آیت ۹۰۔ سورہ ۱۵۔ آیت ۶۷۔ سورہ ۔ آیت ۶۱ و ۲۲۳۔ سورہ ۷۶۔ آیت ۹۹۸۔ سورہ ۱۰۔ آیت ۱۳۸۔ سورہ ۱۳۔ آیت ۲۲۰ سورہ ۹۔ آیت ۲۸[7] سورہ ۲۔ آیت ۱۷۲۔ سورہ ۳۵۔ آیت ۲۷۳۔ سورہ ۸۔ آیت ۴۷۔ سورہ ۱۳۰۔ آیت ۲۲ [8] سورہ ۲۔ آیت ۲۸۳۔ سورہ ۴۔ آیت ۳۵؛ سورہ ۵۰۔ آیت ۸۔ سورہ ۲۱۔ آیت ۳۱۔ سورہ ۳۵ آیت ۷۰۔ سورہ ۳۔ آیت ۱۰۳ +

ان آٹھ اخلاق کے علاوہ اور بہت سے اخلاق بھی ذکر کئے ہیں لیکن ان میں سے دو تو ایسے اخلاق قابل ذکر ہیں جو مذکورہ بالا اقسام اخلاق کے برتنے میں مؤیدات کا کام دیتے ہیں یعنی صبر و مواسات (ایک دوسرے سے ہمدردی)۔

میں نے فٹ نوٹ میں قرآن کریم کی ان آیات کا ہی حوالہ علی الخصوص دیا ہے جہاں ان اخلاق کے محل وقوع کا ذکر ہے۔ یعنی جہاں اسبات کو دکھلایا گیا ہے کہ کوئی طبعی میلان اُس وقت اخلاق فاضلہ بنتا ہے جب فلاں فلاں شرائط اس میں موجود ہوں ورنہ وہ اخلاق نہیں۔ عفو اس وقت اخلاق فاضلہ بنتا ہے جب ہمیں دشمن سے انتقام لینے کی کامل طاقت ہو اور دشمن ہمارے پاؤں تلے ہو اور ہمارا انتقام بھی جائز انتقام ہو اُس وقت معاف کر دینا ہی ایک خلق عظیم ہوتا ہے میں اس موقعہ پر مواسات پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ قومی ہمدردی یا قومی تعاون یا حب وطن۔ ایک مستحسن امر ہے ہر ایک جگہ اسی کا راگ گایا جاتا ہے لیکن اس کا طریق ظہور جو آج خصوصاً ہندوستان میں ہو رہا ہے وہ وہ اخلاق فاضلہ چھوڑ اس مفروضہ اخلاق کے برتنے والے ہیں وہ اخلاق فاسدہ پیدا کر دیتا ہے۔ اپنی قوم کی حمایت یا کسی قوم کے مقابل اپنے ہم نشینوں کی آواز پر جمع ہو جانا ہمدردی یا مواسات نہیں کہلاتا۔ یہ بات تو حیوانوں میں بھی موجود ہے ایک کتے کے بھونکنے یا کوے کے پکارنے پر محلے کے کتے یا شہر کے کوے مخالف پر حملہ کرنے کیلئے جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کوؤں میں یا ہندوستان کی بعض قوموں میں کیا فرق ہے حقیقی ہمدردی یا معاونت قوم اس اصول پر ہونی چاہئے کہ اس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو نہ کسی ہم قوم کے ظالمانہ فعل کی حمایت ہو۔ مثلاً قرآن کریم نے فرمایا لا یجرمنکم شنآن قوم الا تعدلوا ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی مخالفت یا عداوت تمہیں اسی قوم کے معاملہ میں عدل سے روک دے۔ اس معیار کو سامنے رکھکر جو ہمدردی قوم آجکل ہندوستان میں بعض قومیں ظاہر کرتی ہیں۔ وہ ہمدردی تو نہیں۔ ظلم ہے۔ بہرحال لازمی امر جو ہمدردی اور تعاون کا ہے۔ وہ قرآن کریم نے الفاظ ذیل میں صاف فرمادیا۔ تعاونوا بالبر والتقوی ولا تعاونوا بالاثم والعدوان +

جولائی سنہ ۱۹۲۴ء
مقام سرینگر کشمیر

خواجہ کمال الدین

آیت ۱۲۵

سورہ ۲ - آیت ۱۵۳ و ۱۵۵ و ۲۰۰ و ۱۷۷ ۔ سورہ ۴ آیت ۱۰۴ تا آیت ۱۰۷ سورہ ۵

تصنیفات حضرت خواجہ کمال الدین صاحب بی اے ایل ایل بی مسلم مشنری ووکنگ (انگلستان)

براہین نیرہ	۱۲/	اسلام اور علوم جدیدہ	۴/
اُم الالسنہ	۱۲/	اسلام میں کوئی فرقہ نہیں	۱۴/
اسوۂ حسنہ	۸/	راز حیات یا انجیل عمل زیر طبع	
مسجد ووکنگ کے ابتدائی خطبات	۲/	ضرورت الہام	؍؍
توحید ۔ دعا ۔ تصوّف	۲/	توحید فے الاسلام	؍؍
خطبات عیدین	۲/	مکالمات بلّیہ	؍؍
دہریوں اور ملحدین کو خطاب	۲/	سیر افکار یار و حانیات فے الاسلام	؍؍
اسلام اور دیگر مذاہب	۳/	سلک مروارید	؍؍
حقوق النسوان	۲/	باطنیات اسلام	؍؍
مسلم مشنری کے ولائتی لیکچر حصہ اول	۱/	مطالعۂ اسلام	؍؍
؍؍ ؍؍ حصہ دوم	۱/	ہستی باریتعالےٰ	؍؍
؍؍ ؍؍ حصہ سوم	۱/		
لندن میں جلسۂ مولود النبی صلعم	۲/		
لمعات انوار محمدیہ	۶/		
ذرات عالم کا مذہب	۸/		
مسیح کی الوہیت اور اسکی کامل انسانیت ایک نظر	۶/		

تصنیفات دیگر مصنفین

قرآن اور جنگ ۔ تفسیر سورۂ فاتحہ
سیرت نبوی (آنحضرت صلعم کی زندگی کا مختصر سا خاکہ) لغذات اسلام
دُنیا کے مشہور شہدائے ثلاثہ ۸/

المشتہر خواجہ عبد الغنی مینجر مسلم بک سوسائٹی ۔ عزیز منزل لاہور